شجرہائے سایہ دار

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ اور بیگم مودودیؒ پر ایک زندہ تحریر

سیدہ حمیرا مودودیؒ

گزارشات

سنہ 2003ء تذکار سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے حوالے سے ایک یادگار سال تھا۔ سیدی کے صد سالہ، سالِ ولادت کو حوالہ بناتے ہوئے، اس سال کے دوران نہ صرف پاکستان میں، بلکہ بیرونِ ملک بھی، مختلف علمی اداروں نے مذاکروں، مضامین و مقالات اور مطبوعات کے ذریعے بھی اس بطلِ جلیل کی علمی اور دینی خدمات کا اعتراف کیا۔ یہ اعتراف اور یہ تذکرہ، مرحوم کی غیرت ایمانی، جرات مجاہدانہ اور بصیرتِ علمی کا مظہر ہے۔ سید مودودیؒ انہی مردانِ راہ میں سے تھے، جن کے بارے میں اقبال کہہ گئے ہیں:

نشان راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو

ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لیے

ماہ نامہ ترجمان القرآن، لاہور کی دو خصوصی اشاعتیں (حصہ اول: اکتوبر 2003ء، حصہ دوم: اپریل 2004ء) اسی تذکرے کا ایک حصہ تھیں۔ مذکورہ خصوصی اشاعتوں میں قوسِ قزح کے رنگ تھے، پاکیزہ جذبوں کی آنچ تھی اور رہوارِ قلم کو روک روک کر چلنے کا قرینہ تھا۔ انہی مضامین میں سید محترم کی صاحبزادی سیدہ حمیرا خاتون صاحبہ کا مضمون ''شجر ہائے سایہ دار'' سامنے آیا۔ واقعہ یہ ہے کہ صبر سے گندھے، آنسوؤں سے لکھے اور خوشبو کے پیکر میں ڈھلے اس نثر پارے میں ایک عبدِ رحمٰن اور عاشق رسولؐ کی زندگی کا ایک عکس تھا۔

؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟

شہیدؒ نے اپنی معرکہ آرا تفسیر فی ظلال القرآن میں '' المسلم العظیم'' کے نام سے یاد کیا ہے) اور ایک عظیم سپوت کے عظیم والدین اور ان کی عظیم شریک حیات کے صبر و ثبات کی داستانِ عزیمت ہے۔ اس عظیم اسلامی تحریک کے داعی کا تعلق اس گھر سے تھا، جس میں چھوٹے چھوٹے نو بچے تھے، والدہ تھیں اور انتہائی کمزور صحت والی دمے کی مریضہ شریکِ حیات تھیں۔ اگر اس گھر کے مکین ایک لمحے کے لیے بھی صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے تو یہ سب کچھ ایسا نہ ہوتا جیسا کہ آج نظر آ رہا ہے۔ تحریک، عمل اور قیادت کا تعلق بہر حال انسانوں اور ان کے رویوں سے ہوتا ہے۔ کوئی محاذ کی پہلی صف میں اور کوئی پچھلی صف میں ہوتا ہے اور بعض بظاہر محاذ پر نہیں بھی نظر آتے مگر معرکے میں ان سبھی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ یہ داستان دراصل قربانی اور خود داری کی داستان ہے۔ اس گھر کی ایک جھلک اس کتاب میں دکھائی گئی ہے، جس سے قارئین کو کچھ تھوڑا سا اندازہ ہو پائے گا کہ

کیا گزرتی ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

رسالے کے محدود صفحات کی بنا پر ''شجر ہائے سایہ دار'' (دادی اماں ابا جان اور والدہ صاحبہ) کے بارے میں کچھ زیادہ نہ لکھا جا سکا تھا۔ چنانچہ انہیں نظر ثانی اور چند اضافوں کے ساتھ قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔

سیدہ حمیرا مودودی

اللہ تعالیٰ جب کسی شخص کے سپرد کوئی بڑا کام کرتا ہے تو اس کے لیے ابتدا ہی میں ایسے اسباب فراہم کر دیتا ہے کہ وہ اوائل عمر سے اپنی منزل کا تعین کر کے یکسوئی کے ساتھ اس کی طرف گامزن ہوتا ہے۔

والد محترم، اہل بیت سے نسبت رکھنے والے ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جس نے پہلے ہرات کی طرف اور پھر اپنے جد امجد قطب الدین مودود چشتی (سنہ 1039ء- سنہ 1133ء] کے زمانے میں ہندوستان کی طرف ہجرت کی۔ سید قطب الدین مسلسلہ چشتیہ کے سب سے بڑے بزرگ تھے۔ یہ سلسلہ، قرآن و سنت کی پابندی کا خصوصی التزام کرتا ہے۔ ہمارے دادا ابا (سید احمد حسن: سنہ 1855ء تا سنہ 1920ء) نے وکالت کا پیشہ تو اختیار کیا تھا لیکن اکثر عبادت و زہد کے باعث وہ پیشہ وکالت کو بہت زیادہ وقت نہ دے پاتے اور پھر جس مقدمے کو حق و انصاف کے مطابق پاتے، صرف اسی کی پیروی کرتے۔

زاہدانہ زندگی کے اسی دور میں حیدر آباد، دکن (اب مہاراشٹر) کے شہر اورنگ آباد میں 25 ستمبر 1903ء کو ابا جان کی ولادت ہوئی۔ زہد کی اسی فضا میں والد محترم کی پرورش ہوئی۔ ان کی شخصیت پر ہمارے دادا ابا کی تربیت کا بڑا گہرا اثر تھا۔ وہ اپنے کم سن بچے کو اپنے ساتھ مسجد لے جاتے تھے اور انہیں اپنے ہم عصر علما و فضلا کی مجالس میں بٹھاتے تھے۔ قرآن کریم کی سورتیں یاد کراتے۔ عربی اور فصیح اُردو بولنے کی تعلیم ان کو دادا ابا ہی نے دی تھی۔

دادا ابا، ابا جان کو راتوں میں انبیا علیہم السلام کے واقعات، بزرگان دین کے حالات اور اسلامی تاریخ کی کہانیاں سناتے۔ اسلامی عقائد ذہن نشین کراتے اور ان پر دینی رنگ چڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ عام نشست و برخاست میں بھی اخلاق و تہذیب کی اصلاح کا خیال ہمیشہ غالب رہتا تھا۔ اردو زبان کی صحت کی طرف بھی ان کی خاص توجہ تھی۔ ابا جان بتایا کرتے تھے: ''والد محترم اگر مجھ میں کوئی خراب عادت دیکھتے تو وہ اسے چھڑا دیا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے اپنے گھریلو ملازم کے بچے کو مارا تو انھوں نے اس بچے کو بلایا اور کہا: جیسے اس نے تمہیں مارا ہے، تم بھی ویسے ہی اسے مارو! اس واقعے نے مجھے ایسا سبق سکھایا جو ساری زندگی میرے کام آتا رہا اور پھر زندگی بھر کسی زیر دست پر میرا ہاتھ نہیں اٹھ سکا۔''

مدرسے بھیجنے سے قبل گھر پر ہی ان کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ اس ضمن میں ابا جان نے ایک جگہ لکھا ہے: ''میرا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جس میں تیرہ سو (1300) برس تک سلسلہ ارشاد و ہدایت اور فقر و درویشی جاری رہا ہے۔ اس خاندان کے ایک نامور بزرگ خواجہ ابو احمد ابدال چشتی، حضرت حسن مثنٰی ابن حضرت امام حسن کی اولاد سے تھے۔ خواجہ ناصر الدین ابو یوسف کے فرزند اکبر خواجہ قطب الدین مودود چشتی تھے، جو تمام سلاسل چشتیہ ہند کے شیخ الشیوخ اور خاندان مودودی کے مورث اعلیٰ ہیں۔

ے ابو الاعلی مودودی: علمی و فکری مطالعہ مرتبہ: رفیع الدین ہاشمی، سلیم منصور خالد (مقالہ: سید احمد حسن کا گھرانہ، از آباد شاہ پوری) ادارہ معارف اسلامی، لاہور۔

اس زمانے میں انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کے خلاف مسلمانوں میں جو شدید نفرت پھیلی ہوئی تھی، اس کا حال سب جانتے ہیں مگر ہمارا خاندان اس میں عام مسلمانوں سے بھی کچھ زیادہ بڑھا ہوا تھا کیونکہ یہاں مذہب کے ساتھ ساتھ مذہبی پیشوائی بھی شامل تھی۔ والد مرحوم اور والدہ ماجدہ دونوں کی زندگی ایک ہی مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ ان کی اس تربیت اور عملی نمونے کا یہ اثر تھا کہ ابتدا ہی سے میرے دل و دماغ پر مذہب کے گہرے نقوش مرتسم ہو گئے۔ والد مرحوم نے اول دن سے اردو اور فارسی کے ساتھ عربی زبان، فقہ اور حدیث کے درس پر ڈال دیا۔

ابا جان نے اپنے ایک نامور استاد کے بارے میں بتایا: اس زمانے میں دہلی میں مولانا عبد السلام نیازی صاحب فلسفہ و معقولات (ریاضی و منطق وغیرہ) کے ماہر تھے۔ نہایت شیوہ بیان و طلیق اللسان کہ گھنٹوں ان کی گفتگو سن کر بھی آدمی سیر نہیں ہوتا تھا۔ میرے والد ماجد کے بہت عقیدت مند تھے۔ والد صاحب مرحوم نے میرے بچپن ہی میں ان سے کہہ دیا تھا کہ اسے عربی پڑھانا ہے۔ چنانچہ بچپن میں بھی میں نے ان سے پڑھا تھا۔ جب والد مرحوم نے دبی زبان سے پوچھا کہ آپ پڑھانے کا معاوضہ کیا لیں گے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ میں علم بیچتا نہیں ہوں (واہ، کیا زمانہ تھا وہ بھی! آج تو ٹیوشن سنٹر کے نام سے گلی گلی علم کی چھابڑیاں لگائے استاد بیٹھے علم بیچ رہے ہیں!) الغرض وہ تعلیم و تدریس کا کوئی معاوضہ قبول نہ کرتے تھے۔

پھر **الجمیعۃ**، دہلی کی ادارت کے زمانے میں جب ان سے عرض کیا کہ کچھ کتابیں رہ گئی ہیں، انہیں پڑھنا چاہتا ہوں تو فوراً مان گئے۔ فرمایا: ''صبح کی اذان کے وقت میرے مکان پر آ جایا کرو۔ ان کا مکان، ہمارے مکان سے کافی دور تقریباً ڈیڑھ میل (دو کلومیٹر) کے فاصلے پر ترکمان دروازے کے قریب تیلیوں کی گلی میں تھا۔ میں باقاعدگی سے صبح کی اذان کے ساتھ ہی ان کے دروازے پر موجود ہوتا۔ کسی روز اگر ان کی طبیعت (پڑھانے پر) آمادہ نہ ہوتی تو اندر ہی سے فرما دیا کرتے: بھئی سید بادشاہ آج طبیعت حاضر نہیں ہے، کل آنا۔

تقریباً اسی زمانے میں دہلی کے ایک کارخانے دار نے بھی مولانا عبد السلام نیازی سے فرمائش کی کہ: آپ سب کو پڑھاتے ہیں، مگر میرے بیٹوں کو نہیں پڑھاتے اس پر مولانا نے جواب میں کہا: کیا کروں تیرے لونڈوں کے سر میں بھیجا ہی نہیں ہے! تو انہیں بھاڑے کے ٹٹوؤں (ٹیوشن پڑھانے والوں) سے پڑھوا، میں انہیں نہیں پڑھا سکتا۔ مولانا (عبد السلام) مرحوم سلسلہ چشتیہ سے وابستگی رکھتے تھے۔ نیازی کی نسبت بھی ایک بزرگ نیاز احمد بریلوی سے عقیدت کی بنا پر تھی۔ وہ بزرگ بھی چشتی تھے۔ (چونکہ) ہمارا خاندان ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کا پیش رو ہے، اس بنا پر سن رسیدگی اور استاد ہونے کے باوجود (مولانا نیازی مرحوم) میری بہت عزت کرتے، اور اسی بنا پر مجھے سید بادشاہ کہہ کر پکارتے تھے۔

سنہ 1924ء کی بات ہے، جب ابا جان رات کے تیسرے پہر نیند سے بیدار ہوتے اور مغل بادشاہ شاہ جہاں کے دور سے آباد دہلی کے قدیم کوچہ پنڈت سے چلتے اور مولانا نیازی کے دروازے پر جا کر دستک دیتے۔ کہا جاتا ہے کہ اس عہد کے ہندوستان میں معقولات (فلسفہ، منطق اور ریاضی) کے علوم اور عربی ادب میں کوئی شخص بھی ان کا ہمسر نہ تھا۔ آزاد منش آدمی تھے۔ زندگی بھر کسی کی ملازمت نہ کی۔ عطر بنا کر اپنا رزق کماتے تھے اور خانقاہوں میں قوالیاں سنتے تھے۔ تعلیم و تدریس کا کوئی معاوضہ قبول نہ کرتے تھے۔ باری تعالیٰ نے اس نابغہ روزگار استاد کو ابا جان کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بنایا، جنہیں نہ تو دیوبند، ندوۃ العلما یا مدرسہ مظاہر العلوم سے تحصیل علم کا موقع ملا اور والد گرامی کی وفات کے سبب سے نہ وہ علی گڑھ ہی پڑھنے جا سکے۔ علمائے کرام کے ایک گروہ نے والد محترم کو صرف اس بنا پر عالم دین تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ نہ وہ کسی دار العلوم سے تعلق رکھتے تھے اور نہ کسی یونیورسٹی ہی سے فارغ التحصیل تھے۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ آج دنیا کی یونیورسٹیوں میں ان کی تصانیف، ان کی فکر اور ان کی برپا کردہ تحریک پر تحقیقی مقالات لکھے جا رہے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد مولانا عبد السلام نیازی کے ایک شاگرد نے، جو دہلی میں مقیم تھے، پاکستان آنے کا ارادہ کیا۔ ملاقات کے لیے مولانا نیازی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: ''لاہور جا رہا ہوں۔''

مولانا عبد السلام نیازی نے انہیں ہدایت کی: ''لاہور جا رہے ہو تو وہاں میرے شاگرد، دو بھائی رہتے ہیں: سید ابو الخیر مودودی اور سید ابو الاعلیٰ مودودی، ان سے ضرور ملنا۔ پہلے چھوٹے کے پاس جانا، پھر بڑے کے پاس اور پھر لا الہ الا اللہ کے معانی پر غور کرنا، مولانا نیازی مرحوم کے بات کرنے کا یہی انداز تھا کہ حصول علم کے لیے حیرت اور تجسس کی فضا پیدا کرتے۔

آئیے، دیکھیں کہ اس گھر کے مکین اور اس کے باسی کیسے تھے۔ پھر ایک ایسا انسان کہ جس کے بارے میں اپنے دور ہی کی ایک عبقری شخصیت نے مذکورہ بالا بات کہی تھی اور پھر علامہ محمد اقبال کے یہ اشعار پڑھیے:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن

گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن

قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن

سنہ 1926ء میں "شدھی تحریک" کا بانی سوامی شردھانند، عشقِ رسالتؐ سے سرشار ایک مسلمان قاضی عبد الرشید کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس قتل پر نسل پرست کانگریسی اور مہا سبھائی ہندوؤں نے ایک طوفان کھڑا کر دیا کہ اسلام خوں ریزی سکھاتا ہے۔ گاندھی جی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اسلام کی فیصلہ کن چیز پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے۔

اس حوالے سے ابا جان لکھتے ہیں: "یہ غوغا آرائی ایک مدت تک بڑے زور و شور سے جاری رہی۔ مولانا محمد علی جوہر نے ان بہتان تراشیوں سے تنگ آ کر جامع مسجد دہلی میں جمعے کا خطبہ دیتے ہوئے آبدیدہ ہو کر کہا: "کاش کوئی اللہ کا بندہ ان الزامات کے جواب میں اسلام کے صحیح تصورِ جہاد پر ایک مبسوط کتاب لکھے اور اس میں جہاد کے خلاف اٹھائے ہوئے تمام اعتراضات کے مدلل جواب دے۔" خطبہ سننے والوں میں، ایک میں بھی تھا۔ میں جب وہاں سے اٹھا تو یہ سوچتا ہوا جامع مسجد کی سیڑھیاں اترنے لگا کہ کیوں نہ میں ہی اللہ کا نام لے کر اپنی سی کوشش کروں۔

تب 1927ء کے اوائل میں ابا جان نے الجهاد في الاسلام کے حوالے سے اخبار الجمیعة، دہلی میں قسط وار لکھنا شروع کیا۔ اخبار کے صفحات اس بحث کے متحمل نہ ہوئے تو ان مباحث کے لیے الگ سے پوری کتاب لکھی۔ اس وقت ابا جان کی عمر صرف 24 برس تھی۔ اس معرکہ آراء کتاب میں ابا جان نے جہاد کی اصل نوعیت اور اہمیت تحقیقی طور پر واضح کر دی۔

2۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی، الجہاد فی الاسلام، ناشر: دارالمصنفین، اعظم گڑھ، طبع اول، سنہ 1348 ہجری/سنہ 1930ء، صفحات: 504۔

انہوں نے ناقابلِ تردید دلائل سے ثابت کیا کہ اسلامی جہاد، اللہ تعالیٰ کی راہ میں حق اور صداقت کے لیے مربوط، منتظم اور مسلسل کوشش کا نام ہے۔ یہ ہرگز کوئی جارحانہ یا ظالمانہ قتل و غارت گری نہیں ہے۔ یہ مظلوموں کا دفاع ہے، کوئی خفیہ تخریب کاری نہیں ہے۔ یہ تعمیر و ترقی کے لیے انتہائی کوشش کا نام ہے، کوئی زیرِ زمین تحریک نہیں ہے، بلکہ یہ جنگ و امن کا اسلامی قانون ہے۔ مجاہدِ اسلام، دشمنوں کا بھی محافظ و پشت پناہ بن کر دیارِ غیر میں قدم رکھتا ہے۔ وہ قیدیوں کے ساتھ انسانی برتاؤ کرتا ہے اور عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور بیماروں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا اور عبادت گاہوں کو ہر قسم کا تحفظ فراہم کرتا ہے۔

اسلامی جہاد کی یہ صحیح تصویر آج کی نام نہاد، مہذب اور روشن خیال کہلانے والی غیر مسلم طاقتوں کو اسی طرح تہذیب اور احترامِ آدمیت کا سبق دیتی ہے، جس طرح ماضی کے انتہائی طاقت ور اور متمدن ملکوں کو اس نے انسانیت کا درس دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جنگ اور امن کے نام پر جتنے بھی مہذب قوانین جنیوا کنونشن اور اقوامِ متحدہ نے متعارف کرائے ہیں، وہ سب اسلامی جہاد کے اصولوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔

اس کتاب میں جہادِ اسلامی کے خلاف یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے منفی اور ظالمانہ پروپیگنڈے کا منہ توڑ جواب دیا گیا ہے۔ در حقیقت یہ مسئلہ ماضی میں بھی موضوع بحث بنا رہا ہے اور آج بھی دنیا میں سب سے اہم موضوع بنا ہوا ہے۔ مگر افسوس کہ اس کی اصل حقیقت مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی نگاہوں سے اوجھل رہی ہے۔

الجہاد فی الاسلام کتابی صورت میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی تو اسے پڑھ کر علامہ محمد اقبال نے فرمایا: اسلام کے نظریہ جہاد اور اس کے قانون صلح و جنگ پر یہ ایک بہترین تصنیف ہے اور میں ہر ذی علم آدمی کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس کا مطالعہ کرے۔ یہی کتاب بے مثل فلسفی، شاعر اور مفکر اسلام علامہ محمد اقبال کے ساتھ ابا جان کے تعارف اور تعلق کا باعث بنی، یہاں تک کہ علامہ محمد اقبال نے 1937ء میں ابا جان کو لاہور بلا لیا، تا کہ پوری یکسوئی کے ساتھ اطمینان سے بیٹھ کر جہاد اور اجتہاد اور علم و تربیت کی جملہ سرگرمیوں کو آگے بڑھایا جا سکے۔

3۔ دیکھیے: ڈاکٹر جاوید اقبال زندہ رود، جلد سوم، صفحہ 613۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی: خطوط مودودی، دوم (بنام نیاز علی خان، صفحہ 41-154، اور بنام سید نذیر نیازی، صفحہ 180-192) مرتبہ: رفیع الدین ہاشمی، سلیم منصور خالد۔

آباد شاہ پوری: تاریخ جماعت اسلامی، اول۔

سید اسعد گیلانی: اقبال، دار الاسلام اور مودودی۔

گویا قدرت نے لگلے ہی سال علامہ اقبال کی وفات سے پیدا ہونے والے خلا کو ایک دوسرے انداز سے پر کرنا والد محترم کے مقدر میں لکھ دیا تھا۔ یہ لاہور کی سر زمین بھی عجب سر زمین ہے، جو کبھی صوفیا، صلحا اور زہاد سے خالی نہیں رہی۔ سید علی ہجویری معروف بزرگان دین میں سے ہیں جن سے اس ملک کی کثیر آبادی گہری عقیدت رکھتی ہے۔ خواجہ نظام الدین اولیا روایت کرتے ہیں کہ سید ہجویری اپنے مرشد کی ہدایت پر اللہ کے دین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے سلطان محمود غزنوی کے بیٹے ناصر الدین مسعود کے زمانے میں لاہور تشریف لائے تھے۔

چنانچہ کئی صدیوں بعد سید علی ہجویری کی نگری، لاہور میں ایک اور زاہد شب زندہ دار، فاتح تختہ دار، گوہر شب چراغ ہجرت کر کے آتا ہے اور چراغ سے چراغ روشن کرتے ہوئے اسلام کو غالب کرنے کی ایک ہمہ گیر تحریک اٹھاتا ہے۔ جس طرح مغربی تہذیب یہاں سیلاب کی مانند در آئی اور زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو گئی تھی، اس کے ہمہ گیر طغیان کا توڑ اس کے بغیر ممکن نہیں تھا کہ تعلیمی، سماجی، سیاسی اور معاشی میدانوں میں مثبت انداز سے ایک صالح انقلاب کی بنیاد رکھی جائے۔ چنانچہ خود ابا جان کے الفاظ ہیں:

"مسلمانوں کی مغرب سے سیاسی و عسکری شکست سے بڑھ کر خطرناک ترین بات ان کا مغربی تہذیب و ثقافت اور فلسفے کے سامنے سپر ڈال دینا ہے، اس لیے کہ سیاسی غلبے نے صرف جسموں کو فتح کیا تھا، جب کہ اس کی تہذیبی اور فکری یلغار نے تو دل و دماغ اور سوچ و فکر کا دھارا ہی بدل کر رکھ دیا۔ انگریزی علم و ادب، فلسفے اور تہذیب و تمدن نے ہم مسلمانوں کے اندر ایسے اشخاص پیدا کر لیے ہیں جن کے ذہن پوری طرح اس کے قبضے میں ہیں۔ یہ لوگ اپنی زندگیوں کو اس طریقے سے ہٹ کر گزارنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے جس کا نقشہ مغرب نے ان کے سامنے پیش کیا ہے۔"

والد محترم نے جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد، دکن میں ملازمت کی پیش کش اپنے اصول کی خاطر مسترد کر دی تھی، حالانکہ اس دور میں وہ شدید معاشی مشکلات سے دوچار تھے۔

الجہاد فی الاسلام کی تصنیف سے پہلے وہ گیتا، رامائن، مہا بھارت وغیرہ کا مطالعہ کر چکے تھے۔ بائبل اور تالمود بھی باریک بینی سے پڑھ ڈالی تھیں۔ مولانا اشفاق الرحمن کاندھلوی کے ہاں جامع ترمذی اور موطا امام مالکؒ کے درس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ابا جان نے قرآن، حدیث، فقہی علوم، تاریخ اسلامی، سیاسیات، معاشیات اور عمرانیات جیسے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا۔ تصانیف کی کثرت کے باوجود معیار کو برقرار رکھا۔ اس کے ساتھ ہی عربی ادب اور انشا، فلسفے اور منطق میں بھی کمال درجے کی مہارت رکھتے تھے۔ مزید برآں جو اطمینانِ قلب، رضا بہ قضا اور دل کی سکینت انہیں میسر تھی وہ باری تعالیٰ کی خاص عنایت تھی۔

جب کفر، الحاد اور تشکیک کے منہ زور جھکڑوں کے سبب ایمان و ایقان کے چراغ ایک، ایک کر کے گل ہوتے جا رہے تھے تو ابا جان نے نالہ نیم شبی کی مناجات اور دن بھر تحقیق و جستجو کے ملاپ سے افکار کی دنیا بدل کر رکھ دی۔ جدید تعلیم یافتہ طبقوں کو مغربی تہذیب سے مرعوبیت اور ذہنی غلامی سے نجات دلائی۔ پڑھی لکھی نوجوان نسل کو اپنے دین پر فخر اور شکر کرنا سکھایا۔ انہوں نے تفہیم القرآن کے ذریعے جدید تعلیم یافتہ طبقے کا تعلق قرآن سے جوڑ دیا اور ان کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ علامہ اقبال کے بقول:

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود

جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

(ترجمہ) یہ قرآن جب دل کے اندر داخل ہو جاتا ہے تو انسان بدل جاتا ہے اور جب انسان ہی بدل جاتا ہے تو یہ سارا جہان بدل جاتا ہے۔

جیسا کہ ہر دور کے کچھ مخصوص فتنے ہوتے ہیں، اسی طرح ہمارے دور کا سب سے بڑا فتنہ پڑھی لکھی جاہلیت ہے۔ مراد یہ کہ جدید تعلیم یافتہ افراد جو صرف اپنے کسی مخصوص میدان کار میں ڈگری حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کے سر میں دین کے بارے میں یہ سودا سما جاتا ہے کہ وہی اپنے وقت کے افلاطون اور بقراط ہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر کچھ ہیں لیکن ابا جان کی کتابیں پڑھ کر ان حضرات کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ تو اس میدان میں محض طفلِ مکتب ہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ جب سب بستروں پر خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہوتے تھے، اس وقت وہ زاہد شب زندہ دار، اپنے خونِ جگر سے ایسی کتابیں تصنیف کر رہا ہوتا تھا، جو اسلامی اُمت کو دنیاوی اور اخروی زندگی میں کامیابی کی راہ دکھانے والی تھیں۔

جب ہماری اماں جان (محمودہ بیگم مرحومہ) کی عمر تقریباً بارہ برس تھی، انھوں نے ایک خواب دیکھا کہ میں نے ریت میں اپنا پاؤں رکھ کر اوپر سے ریت دبا دبا کر ایک گھروندا بنایا اور پاؤں باہر کھینچ کر اس گھروندے میں ہاتھ ڈالا تو ایک بڑا چمک دار ہیرا میرے ہاتھ آیا۔ اس ہیرے پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ اتنے میں چاروں طرف سے لوگ دوڑتے ہوئے آئے، وہ کہہ رہے تھے: یہ ہیرا بہت قیمتی ہے، تمہیں کہاں سے ملا ہے؟ ایک نے کہا: "اس نادر ہیرے کو سنبھال کر رکھنا، کہیں کوئی اسے تم سے چھین نہ لے۔" صبح ہوتے ہی اماں جان نے یہ خواب نانا ابا (سید نصیر الدین شمسی) کو سنایا۔ وہ دہلی کے ایک جید عالم سے تعبیر پوچھنے چلے گئے۔ انھوں نے کہا: "غالباً اس لڑکی کی شادی ایک بڑے عالم دین سے ہو گی جس کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلے گی۔"

نانا ابا معاشی اعتبار سے خاصے خوش حال اور سماجی حیثیت سے دہلی کے معروف اور بلند مرتبہ لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اسی مناسبت سے میری والدہ محترمہ کے لیے دہلی کے بڑے صاحب ثروت خاندانوں سے رشتے آئے مگر نانا ابا کی نگاہ میں کوئی سمایا نہیں لیکن جب دادی اماں، ابا جان کا رشتہ لے کر آئیں تو نانا ابا کو گویا من کی مراد مل گئی۔

ابا جان کی زندگی کا بیش تر حصہ مسلسل سفر، نقل مکانی، یا معاشی عدم استحکام میں گزر رہا تھا۔ وہ بڑے صاف گو انسان تھے، اس لیے انہوں نے شادی سے پہلے، نانا ابو کو بغیر کسی لاگ لپیٹ کے آگاہ کر دیا تھا: ”میرا نصب العین یہ ہے، جس پر میں کوئی مصالحت نہیں کر سکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو ایک اچھا گھر بھی بنا لوں گا کیونکہ سب کچھ ہوتے سوتے خراب حالات میں رہنے کا قائل نہیں ہوں لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے معاشی کشادگی نہ دی تو خستہ حالی میں بھی اپنے مشن کو نہیں چھوڑوں گا۔“

اس بات کا جواب ہمارے پرنانا جان (یعنی اماں جان کے دادا ابا) نے والد گرامی کے نام خط کے ذریعے دیا اور خط روانہ کرنے سے قبل اماں جان اور نانی اماں کو سنایا۔ اماں جان کے بقول اس خط میں لکھا تھا: ”ہماری بیٹی محل میں بھی تمہارا ساتھ دے گی اور جھونپڑے میں بھی تمہارے ساتھ رہے گی۔“ اماں جان کہتی تھیں: ”دادا ابا کا یہ جملہ ساری زندگی میرے کانوں میں گونجتا اور میرے عزم و ارادے کو تقویت دیتا رہا ہے۔ 15 مارچ 1938ء کو اماں جان کی شادی دہلی میں ابا جان سے ہو گئی۔ مہر کی رقم دو ہزار تھی۔ ابا جان نے صاف کہہ دیا تھا: ”مہر ادا کرنے کے لیے ہوتا ہے، اس لیے مقررہ مہر سے زیادہ ادا کرنے کی حیثیت نہیں رکھتا۔“ بری میں ایک ساڑھی اور ایک انگوٹھی آئی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جب دہلی کے شرفا میں سوا لاکھ سکہ رائج الوقت مہر لکھا تو جاتا تھا لیکن ادا کرنے کا کوئی رواج نہیں ہوتا تھا۔

ز آب و گِل خدا خوش پیکرے ساخت

جہانے از ارم زیبا ترے ساخت

ولے ساقی ب آں آتش کہ دارد

زِ خاکِ من جہانِ دیگرے ساخت

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ نے پانی اور مٹی سے خوب صورت پیکر (انسان) بنایا، ایک جہان جنت سے بھی زیادہ خوب صورت تشکیل دیا مگر ساقی نے اس آگ کی بدولت جو اس کے پاس ہے، میری مٹی سے ایک اور ہی جہان بنا لیا۔

جموں کے پہاڑی سلسلے کے اختتام پر پنجاب میں پٹھان کوٹ کا شہر آباد ہے۔ پٹھان کوٹ کے نواح میں ایک گاؤں ”سرنا“ ہے جس کے قرب و جوار میں چودھری نیاز علی خانؒ کا ایک وسیع رقبہ تھا۔ جہاں پر انہوں نے علامہ محمد اقبال کے مشورے سے ایک ٹرسٹ قائم کیا تھا۔ ابا جان نے اس ٹرسٹ کا نام دار الاسلام تجویز کیا تھا۔

میں نے اسی دار الاسلام میں شعور کی آنکھ کھولی اور بچپن کے کچھ برس یہیں گزارے۔ نہایت سرسبز و شاداب اور خوب صورت مقام تھا۔ ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر مادھو پور کا ہیڈ ورکس تھا۔ سامنے پہاڑوں پر پڑی برف نظر نواز ہوتی تھی۔ جیسے جیسے سورج بلند ہوتا، برف اپنے رنگ بدلتی جاتی تھی۔ پھر جونہی سورج ڈھلتا، برف سفید دودھیا سے رفتہ رفتہ گہرے نارنجی رنگ اختیار کرتی چلی جاتی اور سورج غروب ہونے کے بعد تک شفق کے رنگوں میں نیرنگی نظر آتی تھی۔ غرض یہ کہ قدرت کی رعنائیاں بھر پور طریقے سے وہاں نظر آتی تھیں۔ وہاں شہروں جیسی کوئی سہولیات موجود نہیں تھیں۔ بجلی کے قمقموں اور پانی کی سپلائی کے لیے نلکوں کا اس جگہ تصور بھی نہ تھا۔ گھر بھی بہت سیدھا سادا سا تھا لیکن اس کے باوجود ابا جان سے جو ممکن ہو سکا، اپنے محدود وسائل میں آرام مہیا کیا اور ہر طرح سے ہماری اماں جان کی دل جوئی کی۔ ہماری والدہ جو دہلی کے ایک خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں، انہوں نے بھی بڑے صبر، حوصلے اور بڑی خوش دلی سے وہاں ابا جان کا ساتھ دیا۔ ابا جان نے وہاں آمد و رفت کے لیے گھوڑا تانگا خریدا، جسے ایک ترکستانی کوچوان تُختہ بیگ چلاتے

تھے۔ دہلی سے ایک ماہر خانساماں کو لے کر آئے جبکہ ایک آیا، بچوں کو سنبھالنے میں اماں جان کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ یہ تینوں ملازم بے حد جاں نثار اور خیر خواہ تھے۔ اماں جان روزانہ صبح کے وقت آیا کو ہدایات دے دیتی تھیں کہ کیا پکانا ہے۔ آیا، خانساماں کو بلا کر بتاتی اور ساری ضروری چیزیں اس کے حوالے کر دیتی تھیں۔ دوپہر اور رات کو خانساماں ہنڈیا پکاتا، متصل کمرے میں لا کر رکھ دیتا تھا اور آیا، اماں جان کو بلا کر کھانا ان کے سپرد کر دیتی تھیں۔ یہ باورچی خانہ، گھر کے بیرونی حصے سے ملحق تھا۔ اس لیے خانساماں کبھی گھر کے اندر نہیں آیا تھا۔ تُختہ بیگ بھی گھر کے اندر کبھی نہیں آئے تھے۔ ہم نے اپنے گھر کے اندر مرد ملازموں کا آنا جانا کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"روڈ ٹو مکہ" کے مصنف علامہ محمد اسد، اپنی بیگم منیرہ صاحبہ اور کم سن بیٹے طلال کے ہمراہ دار الاسلام آئے تھے۔ ہمارے والدین نے ان کو کھانے پر مدعو کیا۔ ہماری اماں جان نے اپنے جہیز کا ڈنر سیٹ نکالا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بعض گھرانوں میں نفاست کا لحاظ رکھتے ہوئے گلاسوں کو اوپر سے جالی کے رومال سے ڈھکا جاتا تھا۔ جالی کے ان رومالوں کا توازن قائم رکھنے کے لیے موٹے موٹے مصنوعی موتی لٹکائے جاتے تھے اور یہ اہتمام اس لیے کیا جاتا تھا کہ گلاسوں میں مکھیاں نہ گریں۔ اس قدر اچھا کھانا پکایا گیا اور اس قدر اچھا دستر خوان سجایا گیا کہ علامہ محمد اسد اور ان کی بیگم بہت ہی خوش ہوئے اور اپنی عزت افزائی پر ہمارے والدین کا شکریہ ادا کیا۔

انہی دنوں انڈین نیشنل کانگریس کے رہنما جواہر لال نہرو کا پرائیویٹ سیکرٹیری بیمار ہوا تو آرام کرنے اپنے گاؤں آیا اور یہ گاؤں "سرنا" کے قریب تھا۔ اس نے اپنے آس پاس کے لوگوں سے ابا جان کا چرچا سنا تو وہ اپنے چند ہندو دوستوں کے ہمراہ دار الاسلام آیا۔ ابا جان سے ملاقات کے دوران اس نے بڑے تیکھے سوالات کیے۔ اسلام اور مسلمانوں کے اوپر تابڑ توڑ حملے کیے، ابا جان نے اس کے سوالوں کے جوابات انتہائی تحمل اور ٹھنڈے دل سے دیے تو وہ لا جواب ہو کر رہ گیا۔ وہ ابا جان کے تحمل اور استدلال کے علاوہ اس بات سے بھی بہت متاثر ہوا کہ ابا جان اس کے تند و تیز اعتراضات اور اشتعال انگیز لب و لہجے کے باوجود مشتعل نہیں ہوئے تھے۔ بعد میں اس نے اپنے احباب سے کہا کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ مسلمانوں میں اس قدر تنظیم اور علم و فضل ہے اور وہ اتنے بیدار مغز بھی ہیں۔ جب اس دور افتادہ چھوٹے سے گاؤں میں ایسے ایسے اسکالر بیٹھے ہیں اور ان میں اتنی خود اعتمادی ہے تو بڑے بڑے شہروں کا کیا حال ہو گا؟ گویا کہ دار الاسلام سے جاتے ہوئے وہ کانگریسی برہمن زادہ سخت تشویش میں مبتلا ہوا۔

اس واقعے کے کچھ ہی عرصے بعد دار الاسلام میں جماعت اسلامی کے ایک اجلاس میں شرکت کے لیے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب اور مولانا جعفر شاہ پھلواروی صاحب تشریف لائے اور دار الاسلام میں چند ہفتوں کے لیے قیام پذیر ہوئے۔ ابا جان نے انہیں اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا اور احتیاط برتتے ہوئے اماں جان کو ہدایت کی کہ تانبے کی جن پلیٹوں میں ہم روزانہ خود کھانا کھاتے ہیں مہمانوں کے لیے بھی بس انہی برتنوں کو دستر خوان پر چنا جائے۔ انہوں نے اماں جان کو ہدایت کی کہ: "نہ اپنے شادی کے ڈنر سیٹ میں کھانا لگانا اور نہ گلاسوں کو موتیوں والے رومالوں سے ڈھکنا۔"

اماں جان نے اصرار کیا کہ اتنے بڑے علمائے دین میرے گھر آئیں اور میں ان کی عزت افزائی اور اکرام کے لیے اپنے اچھے برتن نہ نکالوں اور بس تانبے کے برتنوں میں انہیں کھانا کھلا دوں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

اسی طرح ابا جان نے یہ بھی ہدایت کی تھی کہ زیادہ پر تکلف کھانا نہ تیار کرنا، بس وہی دال دلیا دستر خوان پر پیش کر دینا جو ہم روزانہ کھاتے ہیں۔ اماں جان پھر تڑپ اٹھیں: "اگر ہم بھی اپنے دینی حلقوں کو عزت نہیں دیں گے تو عام لوگوں سے اس کی کیسے توقع کریں گے؟ الغرض بہت پر تکلف کھانا پکایا گیا اور اماں جان نے اپنے بہترین برتنوں سے دستر خوان سجایا۔ مہمان تشریف لائے، کھانا کھایا اور چند روز بعد کُھسر پُھسر شروع ہو گئی، جس کا انجام جماعت اسلامی سے ان بزرگوں کے استعفا کی صورت میں سامنے آیا۔ ان حضرات گرامی قدر نے اپنے دائیں بائیں ملنے والوں سے کہنا شروع کیا کہ: مولانا مودودی

دین داری کے پردے میں دنیا دار آدمی ہیں۔ مولانا کے گھر میں خانساماں کھانا پکاتا ہے، بچے آیا پالتی ہے۔ آیا، مولانا کے بچوں کو بچہ گاڑی میں سیر کرانے لے جاتی ہے۔ یہ بیوی آخر کس مرض کی دوا ہے؟ سُنا ہے کہ مولانا کی بیوی ساڑھی پہنتی ہیں اور کبھی غرارہ۔ پان لگانے کے لیے مولانا کا پان دان چاندی کا ہے۔ پان جس ڈبیا میں رکھے جاتے ہیں، وہ بھی چاندی کی ہے (حالانکہ یہ چاندی کی نہیں، تانبے کی تھی، جس پر قلعی کی ہوئی تھی)۔ یہ سب دین داری کے نام پر دھوکا نہیں تو اور کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

4۔ دیکھیے: خواجہ اقبال احمد ندوی مولانا مودودی کی رفاقت میں: ادارہ مطبوعات سلیمانی، اردو بازار، لاہور۔

دادی اماں (محترمہ رقیہ بیگم: سنہ 1873ء تا 7 دسمبر 1957ء) نے یہ باتیں سنیں تو چھوٹتے ہی کہا: اللہ تعالیٰ بھی تو قد کے مطابق جامہ دیتا ہے، بس اتنا ظرف ہے ان لوگوں میں۔ اس واقعے کے بعد سے اماں جان نے کبھی ابا جان سے اختلاف کر کے اپنی بات نہیں منوائی۔ انہیں ہمیشہ اس بات کا پچھتاوا رہا کہ اگر میں ان کی ہدایت کے مطابق سیدھا سادہ کھانا پکواتی اور تانبے کی پلیٹیں دستر خوان پر رکھتی تو نہ یوں بات کا بتنگڑ بنتا۔ اس واقعے کے بعد ہم نے اپنی زندگی میں اپنے والدین کے درمیان کبھی سخت جملوں کا تبادلہ یا تلخ نوائی کا اظہار نہیں دیکھا۔ البتہ اس کے بعد صرف ایک واقعہ ایسا ضرور رونما ہوا، جب اماں جان اور دادی اماں نے ابا جان سے سخت اختلاف کیا۔ یہ اگست 1947ء کا وہ زمانہ تھا جب ہندوؤں اور سکھوں کی جانب سے مسلم کش فرقہ وارانہ فسادات عروج پر تھے۔ مشیت حق سے ابا جان اور دار الاسلام کے کارکنوں کا رعب و دبدبہ اس قدر تھا کہ آس پاس کے ہندوؤں اور سکھوں کو جرات نہیں ہوئی کہ وہ دار الاسلام کی حدود میں قدم بھی رکھیں۔ یہی وجہ تھی کہ مضافات کے دیہات سے لوگ اپنے اپنے گھر بار چھوڑ کر، اپنے بیوی بچوں اور مویشیوں کے ساتھ دار الاسلام میں پناہ لینے کے لیے آ رہے تھے۔ پورے علاقے سے مسلمان متاثرین کی آمد کا زبردست دباؤ تھا لیکن فوج کی ہمراہی میں صرف تین بسیں ان بے آسرا پناہ گزینوں کو لینے کے لیے آئیں۔ ان میں سے بھی ایک بس، چودھری نیاز علی خاں صاحب کے گھر والوں کو لینے کے لیے بھیج دی گئی۔ اب صرف دو بسیں دار الاسلام کے باسیوں اور وہاں پہنچنے والے پناہ گزینوں کے لیے رہ گئیں۔

ابا جان نے فوری طور پر فیصلہ سنایا: ”اس وقت صرف عورتیں اور بچے ان دو بسوں میں سوار ہو کر لاہور چلے جائیں، مرد بعد میں جائیں گے۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ جو فوجی جوان بسوں کے ساتھ آئے تھے، انہوں نے حکم صادر کیا: ”دس منٹ کے اندر اندر آپ لوگ بسوں میں بیٹھ جائیں، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“ اس وقت دادی اماں اور اماں جان نے کہا: ”ہم مردوں کے بغیر اکیلے کیسے جائیں جبکہ قدم قدم پر لوٹ مار کرنے والے سکھ جتھے کرپانیں سونتے کھڑے ہیں۔“ تقریباً یہی سوال ہر گھر میں زیر بحث تھا۔ چونکہ ہمارا گھر نمونے کا گھر تھا، اس لیے سب کی نظریں اس گھر پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ابا جان نے کہا: ”آس پاس دیہات کے مسلمان اپنے بال بچوں کے ہمراہ میرے پاس پناہ کے لیے آئے ہیں، میں انہیں کیسے بلوائی سکھوں اور ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر، اپنے بیوی بچوں کو لے کر یہاں سے چلا جاؤں؟“ ابا جان نے مزید یہ کہا: ”عورتوں اور بچوں کی موجودگی میں بہادر سے بہادر مرد بھی بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ عورتوں اور بچوں کے جانے کے بعد ہم عزتیں بچانے کی فکر سے تو آزاد ہو جائیں گے۔ باقی رہیں ہماری اپنی جانیں تو جو اللہ کو منظور ہوا وہی ہو گا، اس کی آپ لوگ فکر نہ کریں۔“

اسی گومگو میں وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ فوجی جوان سیٹیوں پر سیٹیاں بجا رہے تھے۔ بالآخر ابا جان نے بڑے مستحکم لہجے میں اماں جان سے کہا: ”جب تک آخری آدمی یہاں سے پاکستان نہیں چلا جاتا، میں یہاں سے نہیں ہلوں گا۔“ یہ سنتے ہی دادی اماں نے اپنے زیر مطالعہ قرآن شریف کو گلے میں لٹکایا، وضو کا لوٹا ہاتھ میں لیا اور اماں جان کے ساتھ بچوں کے ہاتھ پکڑ کر کھینچے ہوئے ہونٹوں اور آنسوؤں سے لبریز آنکھوں اور سُتے ہوئے چہروں کے ساتھ بس میں سوار ہو گئیں۔ جیسے ہی دادی اماں اور اماں جان بس میں بیٹھیں، باقی گھروں کی خواتین اور بچے بھی سوار ہو گئے۔ جب وہاں سے بسیں چلیں تو

کچھ لوگ بے اختیار ہو کر ساتھ ساتھ دوڑنے لگے لیکن ہم نے مڑ کر کھڑکی سے دیکھا کہ ابا جان، چٹان کی طرح جمے اپنی جگہ پر خاموش کھڑے ہماری بس کو پاکستان جاتے دیکھ رہے تھے! عصر اور مغرب کے درمیان یہ بسیں ''سرنا'' سے روانہ ہو کر عشاء کے لگ بھگ امرتسر پہنچیں اور پوری رات وہاں کھڑی رہیں کیونکہ اندھیرے میں سفر خطرناک تھا آدھی رات کو دادی اماں حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کے لیے سب کے روکنے کے باوجود اصرار کر کے بس سے اتر گئیں۔ جب کافی دیر ہو گئی اور دادی اماں واپس نہیں آئیں اور سب لوگ مایوس ہو گئے تو اچانک ہم دیکھتے ہیں کہ دو سکھ، دادی اماں کا ہاتھ پکڑے انہیں ساتھ لیے چلے آ رہے ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ: اماں جی، پچھانو، تہاڈی بس کیہڑی اے؟ (اماں جی، پہچانیے آپ کی بس کون سی ہے؟) ہم نے فوراً آواز دی: دادی اماں ادھر آ جائیے۔ غرض دونوں سکھ سہارا دے کر اماں جی کو بس میں چڑھا کر سلام کر کے خاموشی سے واپس چلے گئے۔ ایک کے ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا لوٹا تھا، وہ بھی اس نے کھڑکی سے اماں جی کو پکڑا دیا۔ بعد میں دادی اماں نے ہم سے کہا: تم لوگ خواہ مخواہ سمجھتے ہو کہ سکھ مارتے ہیں، حالانکہ مارنے جلانے والی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ ابا جان نے، بطور احتیاط دار الاسلام ہی سے جماعت اسلامی کے ایک بزرگ محترم عبد الجبار غازی کو ہمارے قافلے کے ساتھ بھیجا اور ان کو یہ ہدایت کر دی تھی: ''بسیں لے کر وہ سیدھے گوالمنڈی، لاہور میں ملک نصر اللہ خاں عزیز صاحب کے گھر چلے جائیں اور وہاں سے ہم لوگوں کو تانگے میں سوار کر کے اسلامیہ پارک، فصیح منزل میں مولوی ظفر اقبال صاحب کے گھر پہنچا دیں۔ اسی طرح ابا جان نے عبد الجبار غازی صاحب کو تاکید کر کے یہ بھی کہا کہ: ''سب خواتین کو ان کے رشتے داروں کے گھر پہنچا دیں۔'' ہم فصیح منزل میں چند روز تک مقیم رہے۔ اس عرصے میں ابا جان کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ طلوع ہونے والا ہر دن دادی اماں اور اماں جان کے لیے ایک ایک صدی بن کر گزرتا تھا اور ہر رات قیامت کی مانند ہوتی تھی۔ اس پورے عرصے میں مولوی ظفر اقبال صاحب کے گھر والوں نے جس طرح ہماری خاطر مدارات، دل جوئی اور علاج معالجہ کے لیے سہولیات فراہم کیں، اس نے انصارِ مدینہ کی جانب سے مکے کے مہاجرین کی آؤ بھگت کی یاد تازہ کر دی اور پھر ایک دن اچانک ابا جان اپنے رفقا کے ساتھ لاہور پہنچ گئے۔

اگست 1947ء میں تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بعد ہم دار الاسلام پٹھان کوٹ، مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے لاہور آئے تو دار الاسلام کی غیر منقولہ املاک کے بدلے میں ہمیں اور جماعت اسلامی کو چوبرجی کے قریب سوہن لال کالج کی عمارت الاٹ کر دی گئی۔ چند روز بعد ہم فصیح منزل سے سوہن لال کالج چلے آئے۔ دار الاسلام میں ہمارا گھر اور جماعت اسلامی کا دفتر اکٹھے ہی (اب مدرسۃ البنات) تھے۔ اس کالج میں پرنسپل کی کوٹھی ہمیں دی گئی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کوٹھی کے مکین چائے پینے کے دوران اچانک یہ جگہ چھوڑ کر چلے گئے کیونکہ پیالیوں میں چائے سوکھ چکی تھی۔ باورچی خانے میں آٹا خمیر ہو کر سوکھا پڑا تھا۔ الماریوں کے دروازے کھلے تھے اور سامان بکھرا پڑا تھا۔ گھر کی ایک ایک چیز سے حسرت ٹپک رہی تھی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی دادی اماں نے ہمیں سختی سے کہا: جس مال نے اپنے مالک سے وفا نہ کی، وہ ہم سے کیا وفا کرے گا، خبردار اس گھر کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔

ہم لوگ تقریباً دو ماہ تک اس عمارت میں رہے۔ اسی قیام کے دوران میں علامہ محمد اسد اپنی اہلیہ اور بیٹے کے ہمراہ ہم سے ملنے آئے۔ اس کوٹھی کی تیسری منزل سے ہم نے قائد اعظم مرحوم و مغفور کی وہ تقریر سنی تھی جو انھوں نے قیام پاکستان کے بعد پنجاب یونیورسٹی گراؤنڈ کے جلسہ عام (30 اکتوبر 1947ء) میں کی تھی۔

یہی وہ زمانہ تھا جب ابا جان، چودھری محمد علی صاحب (بعد ازاں وزیر اعظم پاکستان) سے بھی ملے اور ان سے کہا تھا: ''مسلم لیگ کے متعدد ذمہ دار لیڈروں کی طرف سے پاکستان کو سیکولر انداز سے چلانے کی باتیں ہو رہی ہیں، یہ بات مظلوموں کے زخموں پر نمک پاشی اور شہیدوں کے خون سے بے وفائی کے مترادف ہے۔ پھر انھوں نے شہدا کی ان لاشوں کی طرف توجہ دلائی جو لاہور کے ریلوے اسٹیشن کے چاروں طرف بے گور و کفن بکھری ہوئی تھیں اور جانور

جن کی بے حرمتی کر رہے تھے (اس لیے کہ جن کا فرض تھا کہ وہ شہدا کی لاشوں کو دفناتے، ان میں سے اکثر تو ہندوؤں اور سکھوں کی کوٹھیاں ہتھیانے اور ان کی دولت ٹھکانے لگانے میں مصروف تھے)۔ ابا جان نے چودھری صاحب سے کہا: "ابھی چند روز قبل شملہ سے سرکاری ملازمین کی ٹرین لاہور پہنچی ہے، جس میں ایک آدمی بھی زندہ سلامت نہیں بچا۔ اس ٹرین کے پہیوں سے خون کے لوتھڑے لٹک رہے تھے، ابھی تو مسلمانوں کی بیٹیاں سکھوں کے گھروں سے بازیاب نہیں ہوئیں، ابھی تو شہدا کی لاشیں تک نہیں دفنائی گئیں کہ پاکستان کو سیکولر ریاست بنانے کی باتیں شروع کر دی گئی ہیں۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے گھر بار چھوڑ کر اس لیے نکل کھڑے ہوئے تھے کہ آپ نے پاکستان کا مطلب کیا لا الہ ال اللہ کا نعرہ لگایا تھا!"

چودھری محمد علی صاحب نے کہا: "میں یہ بات وزیر اعظم لیاقت علی خاں تک پہنچاؤں گا۔ بہر حال ڈیڑھ دو ماہ بعد الٹا یہ ہوا کہ حکومت نے ایک دوسرے فرد کو ہماری قیام گاہوں کا قبضہ لینے کی ہدایات جاری کیں۔

5ـــ دیکھیے: میاں طفیل محمد مشاہدات: ادارہ معارف اسلامی، لاہور

ابا جان نے کسی بحث میں الجھنے کے بجائے اسی روز سوہن لال کالج (چو برجی) خالی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ، مغرب سے ذرا پہلے دو خالی تانگے لے کر آئے اور آتے ہی انہوں نے اماں جان اور دادی اماں سے کہا: "صرف وہ چیزیں اُٹھا لیں جو ہم لوگ دار الاسلام سے اپنے ساتھ لائے تھے اور بچوں کو لے کر فوراً باہر تانگوں میں بیٹھ جائیں۔"

اب نہ دادی اماں نے پوچھا اور نہ ہماری اماں جان نے سوال کیا کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے تو یہاں آ گئے، اب یہاں سے کدھر جانا ہے؟ کیوں؟ کیا؟ اور کس لیے؟ جیسے سوالات پوچھنے کا کلچر ہمارے گھر میں سرے سے تھا ہی نہیں۔ بس جو فیصلہ ابا جان نے کر لیا وہ سب نے بے چون و چرا مان لیا۔ دونوں خواتین خاموشی سے اٹھیں اور اپنی اپنی چیزیں سمیٹنے لگیں جو دار الاسلام سے ہم ساتھ لائے تھے۔ چلتے وقت ہم بچوں نے کچھ کھلونے اٹھا لیے جو اس گھر میں پہلے سے پڑے ہوئے تھے لیکن دادی اماں نے وہ کھلونے ہمارے ہاتھ سے چھین کر نیچے رکھ دیے اور کہا: "تم نے اپنے ابا کی بات نہیں سنی، انھوں نے ہدایت کی ہے کہ یہاں سے کوئی چیز نہ اٹھائیں۔"

ہم باہر نکل کر تانگے میں بیٹھ گئے۔ ابا جان کے دیگر رفقا بھی اسی طرح تانگوں میں بیٹھ رہے تھے پھر یہ قافلہ چو برجی سے آگے اسلامیہ پارک پہنچا، جہاں آج کل ڈاکٹر ریاض قدیر مرحوم کی کوٹھی ہے۔ جماعت اسلامی کے کارکن خیمے لے کر وہاں پہنچ چکے تھے، کیمپ لگ چکا تھا۔ اس کیمپ میں ہم تقریباً ڈھائی ماہ تک قیام پذیر رہے۔ اس واقعے کے اگلے روز ابا جان نے سوہن لال کالج کی چابیاں سرکاری اہل کاروں کے سپرد کر دیں۔ ابا جان نے کسی طرح کا رد عمل ظاہر کیے بغیر جس شان بے نیازی و استغنا سے یہ جگہ خالی کر دی، وہ صرف انھی کے مقام و مرتبے کا انسان کر سکتا تھا۔ ابا جان نے ایک جگہ لکھا ہے: "ایمان چونکہ کوئی خارجی شے نہیں بلکہ ایک قلبی کیفیت کا نام ہے، اس لیے ایمان کی قیمت کوئی باہر کا خریدار نہیں مقرر کر سکتا بلکہ خود صاحب ایمان ہی اس کی قیمت مقرر کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے نزدیک یہ اتنی حقیر شے ہو کہ وہ اسے روٹی کے ایک ٹکڑے کے عوض بے دریغ بیچ ڈالے اور دوسرے کے نزدیک یہ اتنی متاع گراں بہا ہو کہ خدائے ارض و سما سے ورے کوئی گاہک اس کی نگاہوں میں جچے ہی نہیں اور۔۔۔۔ یہی وہ قوت ہے جس سے مسلمان کے دل میں وہ بے پناہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کی ہوئی تہذیب و ثقافت کو برقرار رکھنے کے لیے ہر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ مسلمان سے جب دنیا کی ہر طاقت دبتی تھی تو یہ اس وقت تھا جب اس کی متاع ایمان کو کوئی خریدار کسی قیمت پر خرید نہیں سکتا تھا۔ مسلمان آج ہر قوم سے دبتا اور ڈرتا ہے، یہ اس وقت ہے جب کہ اس کے دل و دماغ سے متاع ایمان کی قدر و قیمت کم ہو گئی ہے۔"

اس وقت سے یہ بات ہمارے دماغوں میں راسخ ہو گئی ہے کہ عزت کا جھونپڑا، ذلت کے محل سے بہتر ہوتا ہے۔ بہر حال وہ مشکل وقت بھی گزر گیا۔ انھی دنوں ابا جان نے جماعت اسلامی میں اپنے رفقا کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے شہدا کی میتوں کو دفنایا جائے۔ اس فیصلے پر عمل درآمد کے لیے ٹرک کرائے پر لیے گئے اور جماعت اسلامی کے کارکن دو ٹیمیں بنا کر اس مشکل کام میں لگ گئے۔ ایک ٹیم اس علاقے میں جہاں آج کل سمن آباد واقع ہے بڑی بڑی اجتماعی قبریں کھودتی تھی اور دوسری ٹیم ٹرک پر لاشیں لاد کر لاتی تھی اور نماز جنازہ پڑھنے کے بعد ان کو اس اجتماعی قبر میں دفنا دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد پہلی ٹیم اگلی قبر کھودنے میں مصروف ہو جاتی تھی اور دوسری ٹیم لاشوں کی اگلی کھیپ لانے کے لیے روانہ ہو جاتی تھی۔ ہم بچے سارا دن وہاں کھڑے یہ منظر دیکھا کرتے تھے۔ کتنی ہی مرتبہ ہم کو وہاں سے یہ کہہ کر بھگایا جاتا تھا کہ: "بچے لاشیں نہیں دیکھا کرتے، رات کے وقت سوتے میں ڈرو گے، بھاگو یہاں سے۔" لیکن ہم بچے تو دار الاسلام سے ہی اتنی لاشیں دیکھتے آ رہے تھے کہ ہمارا ڈر اور خوف ختم ہو چکا تھا۔ یاد رہے کہ یہ ہیں وہ قربانیاں جن کی وجہ سے ہم کو پاکستان جیسی نعمت ملی۔ آج سمن آباد کے مکینوں کو شاید یہ معلوم بھی نہیں ہے کہ وہ تحریک پاکستان کے سیکڑوں شہیدوں کی قبروں پر رہتے اور چلتے پھرتے ہیں!

جب لاشیں دفنا دی گئیں تو پھر جماعت کے کارکنوں نے مہاجرین کے کیمپوں کا چارج سنبھالا۔ مگر اسی دوران میں کچھ سرکاری اہل کاروں اور بعض با اثر قومی رضا کاروں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ انہوں نے عطیے میں آئی رضائیوں، کمبلوں اور اشیائے خورد و نوش کو ہڑپ کرنا شروع کیا۔ وہ لڑکیاں جو سکھوں کی دست برد سے بچ کر، اپنے والدین کی شہادت یا ان سے بچھڑنے کے بعد بے آسرا ہو کر کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گئی تھیں۔ ان میں سے ایک تعداد کے بارے میں یہ لکھتے ہوئے کتنا دکھ ہوتا ہے کہ ان مظلوموں پر بھی بعض ہم وطنوں نے ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ اس پر نہ صرف اخبارات میں خبریں چھپیں بلکہ کئی مظلوم لڑکیاں ابا جان کے پاس بھی یہ فریاد لے کر آئیں کہ: اگر پاکستان پہنچ کر بھی ہماری عزتیں محفوظ نہیں ہیں تو پھر ہم کہاں جائیں؟

اسی دوران میں سکھوں سے بازیاب کی گئی لڑکیاں بھی کیمپوں میں پہنچنے لگیں۔ میرے نزدیک یہ اس زمانے کا درد ناک ترین باب ہے۔ ان میں سے اکثر لڑکیاں زخموں سے چور تھیں۔ میں نے خود دیکھا کہ ایک لڑکی کی آنکھ کسی سکھ نے کرپان کی نوک مار کر ضائع کر دی تھی۔ ایک لڑکی کا چہرہ اب بھی نظروں کے سامنے آتا ہے، جس کے رخسار پر بڑا سا گھاؤ تھا۔ بعض بچیوں کے جسموں پر دانتوں سے کاٹنے کے نشانات تھے، گویا درندوں نے انہیں بھنبھوڑا ہو۔ اس کے علاوہ ان کے سوختہ جان جسموں پر زخموں اور تشدد کے ایسے ایسے نقوش تھے کہ قلم انہیں بیان کرنے کی تاب نہیں رکھتا۔ ان بچیوں نے یہ سب مظالم پاکستان اور اس کے مستقبل کے لیے برداشت کیے تھے۔ یہ تو وہ زخم تھے جو ان کے جسموں پر تھے، مگر وہ زخم جو ان کے دلوں اور ان کی روحوں کو لگے تھے، وہ ظاہری زخموں سے کہیں زیادہ گہرے اور کہیں زیادہ کرب انگیز تھے۔

انہوں نے رو رو کر بتایا کہ: "ہمیں سکھ زبردستی شرابیں پلاتے، انہیں بے لباس کرتے اور اپنے سامنے ناچنے پر مجبور کرتے تھے۔ جو کچھ ان پر گزری، ظلم کی ان داستانوں کو بیان کرنے کے لیے وہ لڑکیاں بے تاب تھیں۔ ہم گھر میں دادی اماں اور اماں جان کے پاس ہوتیں تو وہ یہ خیال کیے بغیر کہ ہم جیسی نو عمر بچیاں بھی بیٹھی ہوئی ہیں، سب کچھ بتانے لگتی تھیں۔ اپنے بدن سے کپڑے ہٹا ہٹا کر زخم دکھانے لگتیں۔ جب اماں جان غم کی شدت اور حیا کی حدت کے ساتھ انہیں فوراً فوراً سمجھاتیں کہ بیٹی، اس طرح کی باتیں نہ بتاؤ اور اس طرح کپڑے ہٹا کر اپنے زخم نہ دکھاؤ۔ تو وہ رو رو کر کہتیں کہ اب باقی رہ ہی کیا گیا ہے جس کی حفاظت کے لیے ہم شرم و حیا کے ان لفظوں کا لحاظ کریں؟ چونکہ یہ باتیں دادی اماں، اماں جان اور ابا جان کے براہ راست علم میں آتی تھیں، اس لیے ان کے گہرے اثرات سے ہمارے گھر کی حالت سوگوار اور فضا بوجھل رہتی تھی۔ اماں جان کی آنکھوں میں آنسوؤں اور ابا جان کے چہرے پر غصے، غیرت اور بے بسی کے رنگ دیکھ کر ہم بچے سہم جاتے تھے۔

ایسی ہی ایک باز یافتہ خاتون سے تو اب بھی اکثر ملنا ہوتا ہے۔ ان کے بیٹے اس وقت بڑے بڑے عہدوں پر ملازم ہیں اور گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے، لیکن ان پر آئے دن افسردگی (depression) کے دورے پڑتے ہیں، خصوصاً اگست کے مہینے میں!

چند برس پیش تر 14 اگست کو فون کر کے انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہنے لگیں: ساری زندگی ماڈل ٹاؤن کی کوٹھی میں رہتے گزر گئی ہے لیکن جب بھی خواب دیکھتی ہوں تو وہی لدھیانہ والا گھر نظر آتا ہے۔ گھر کو آگ لگی ہوئی ہے، باپ کی لاش صحن میں پڑی ہے، پہلے بڑی بہن کو سکھ گھسیٹ کر لے جا رہے ہیں، اس کے بعد ایک سکھ نے، جسے ہم چاچا جی کہتے تھے، مجھے پر ہاتھ ڈالا اور میں دہشت سے بے ہوش ہو گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میری بڑی بہن اجتماعی آبروریزی کا شکار ہو کر دم توڑ گئی۔ میں بے غیرت تھی کہ مجھے موت بھی نہ آئی۔

خاتون نے مزید کہا: "اب ہر سال 14 اگست کو اس قدر روشنیاں ہوتی ہیں اور اس قدر نغمے گائے جاتے ہیں اور وہ ہڑ بونگ مچایا جاتا ہے کہ اس سارے عمل نے ہماری اس سوہنی دھرتی کو قدم قدم برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ جوان لڑکے جن کا فرض اپنے وطن کا دفاع کرنا ہے، کندھوں پر لمبے لمبے بال پھیلائے، لچک لچک کر گانے اور ناچنے تھرکنے میں مصروف نظر آتے ہیں اور یہ سب کچھ یوم آزادی کے نام پر ہو رہا ہے۔ اس آزادی کی جو قیمت ہم نے ادا کی ہے وہ ہم سے پوچھو۔ وطن کی مٹی گواہ رہنا کے بول الا پنے والی مراثنیں کیا جانیں کہ اجتماعی بے حرمتی کا شکار ہونے والیوں پر کیا گزری! تم یقین کرو کہ ہم پاکستانیوں کو آزادی کی نعمت راس نہیں آئی ہے۔ جن ہندوؤں اور سکھوں سے اب یہ دوستی کی پینگیں بڑھا رہے ہیں، انہیں معلوم نہیں ہے کہ ہم بھی اپنے محلے دار سکھوں اور ہندوؤں کو بھاپا جی، ماما جی اور چاچا جی کہتے تھے مگر آخری تجربے میں وہ درندے ہی نکلے!"

پھر یہ بھی کہا: "یقین جانو 14 اگست کے جشن کی روشنیاں ہمارے اندر کے اندھیروں کو اور زیادہ بڑھا دیتی ہیں۔ میری بہن جس کا آنچل بھی کبھی کسی غیر محرم نے نہیں دیکھا تھا، وہ اجتماعی زیادتی کا نشانہ بن کر موت کے گھاٹ اتر گئی اور اب ایسا لگتا ہے کہ شاید ہم نے یہ قربانیاں دی ہی ان بھانڈوں اور میراثیوں کے لیے تھیں، تا کہ وہ یہاں مٹک مٹک کر ناچیں، گائیں اور ان کے حکمران لوٹ مار کریں مجھے بتاؤ کیا پاکستان اس لیے بنایا گیا تھا؟"

اس بزرگ خاتون کی باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا، وہ تو اپنا غصہ نکال رہی تھیں۔ گھر والے لدھیانہ کا نام سنتے ہی ناراض ہو جاتے تھے اور جو کچھ ان کی والدہ پر اور خالہ پر سکھوں کے قبضے میں گزری، اس کا ذکر تک سننے کو تیار نہیں تھے۔ غضب یہ ہے کہ جب کبھی میں ان سے ملنے ان کے گھر جاتی ہوں تو ان کے پوتے پوتیاں مجھے دیکھتے ہی لدھیانہ زندہ باد!" کا نعرہ لگاتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ میں جب بھی آتی ہوں، ان کی دادی اماں لدھیانہ کی باتیں کرتی ہیں۔

ایسی بے خاماں اور تباہ حال لڑکیوں کے لواحقین کو تلاش کرنا، اور ان کے دور و نزدیک کے رشتے داروں کا سراغ لگانا ایک بڑا مشکل کام تھا۔ دل تھام کر ذرا سوچیے، وہ لمحے کتنے درد ناک ہوتے ہوں گے، جب مل جانے کے باوجود لواحقین اپنی بہن، بیٹی کو پہچاننے یا ساتھ لے جانے سے انکار کر دیتے تھے۔ تب ان لڑکیوں کے منہ سے اپنے بھائی، باپ اور خاندان والوں کے لیے بد دعاؤں اور گالیوں کی بوچھاڑ اور دل دہلا دینے والی چیخیں نکلتی تھیں، جنہیں سن کر دہشت سے کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ ابا جان اور ان کے ساتھیوں نے ایسی متعدد لڑکیوں کے نکاح کا انتظام کیا تھا۔

ان امدادی کاموں کے ساتھ ساتھ، ابا جان نے قرار داد مقاصد پاس کرانے کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ پورے ملک کا طوفانی دورہ کیا، ریڈیو پاکستان سے تقریریں کیں اور پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں اسلامی قانون پر لیکچر دیے۔ انتظامی اہل کاروں کی بے حسی، کیمپوں میں متعدد رضا کاروں کا بے دردانہ طرز عمل اور متروکہ املاک کو ہڑپ کرنے کی منظم کوششوں کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ ان تمام کاوشوں نے حکومت کی نظر میں ابا جان اور جماعت اسلامی کو اپنا دشمن نمبر ایک بنا دیا۔ وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں مرحوم اپنے اقتدار کے حوالے سے، جبکہ سیکولر عناصر اپنے لا دینی نظریات کے

حوالے سے، اس ہمہ پہلو جد و جہد سے بہت زچ ہوئے۔ یوں حکومت نے جوابی طور پر پروپیگنڈا مہم شروع کی۔ جہاد کشمیر کے حوالے سے ابا جان پر بے بنیاد الزام لگا کر، جماعت کے کام کے راستے بند کرنا شروع کیے۔ نواب صاحب نے اخبار نویسوں سے کہا: مولانا مودودی، پاکستان کے امیر المومنین بننا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وہ تو مہاجروں سے زیادتی کے خاتمے، امن کی بحالی، لوٹ کھسوٹ سے اجتناب اور خود اہل پاکستان سے کیے جانے والے وعدے یاد دلا رہے تھے۔

ابا جان نے اس زمانے میں بر ملا کہا: اگر اسلامی ریاست کے حوالے سے پاکستان کی سیاسی قیادت اور دستور ساز اسمبلی نے پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ کو باقاعدہ طور پر ریاست کے عقیدے اور نصب العین کے طور پر تسلیم کرنے کا اعلان نہ کیا تو یہ اسلامیان پاک و ہند کے ساتھ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ کا سب سے بڑا دھوکا ہو گا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے قرارداد مقاصد کا تصور دیا، جس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت (sovereignty) تسلیم کرنے اور عوام کو عدل اجتماعی دلوانے کا لائحہ عمل تھا اور پاکستان کو ایک فلاحی ریاست بنانے کا وعدہ تھا۔

اس تصور کو قرارداد کی شکل میں تسلیم کرانے کے لیے مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھرپور آواز بلند کی، مولانا ظفر احمد انصاری، مولانا عثمانی کے معاون تھے۔ پھر خود وزیر اعظم لیاقت علی خاں صاحب اور مسلم لیگ کے بہت سے ارکان اسمبلی نے قرارداد کی تائید کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا۔ قرار داد مقاصد کو تسلیم کرانے کے لیے بھر پور جد و جہد کرنا، ابا جان کا ایک نمایاں ترین کارنامہ ہے۔

جب چھٹے کے عشرے میں پاکستان میں اشتراکیت کی آندھی چلنے کے آثار پیدا ہوئے تو انہوں نے اعلان کیا: "یہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا ملک ہے، یہ کارل مارکس اور ماوزے تنگ کی قوم کا ملک نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے ہمیں لڑنا پڑا تو ہم خدا کے فضل سے دس محاذوں پر بھی لڑنے سے نہ چوکیں گے۔ ہم بیک وقت آمریت کا بھی مقابلہ کریں گے اور بے دینی سے بھی لڑیں گے۔ جب تک ہم زندہ ہیں اور جب تک ہمارے سر ہماری گردنوں پر قائم ہیں، اس وقت تک کسی کی ہمت نہیں کہ وہ یہاں اسلام کے سوا کوئی نظام لا سکے۔"

بعض لوگ اپنی ذات میں انجمن ہوتے ہیں اور بعض ایسے شجر ثمر دار کی مانند کہ جن کے سائے میں اپنے پرائے، امیر غریب، بچے بوڑھے، سب پناہ لیتے ہیں۔ ان کی چھاؤں سب کے لیے ہوتی ہے اور وہ اپنی چھاؤں اور اپنے پھل سے کسی کو بھی محروم نہیں کرتے۔ ہماری اماں جان (بیگم مودودیؒ) اپنی ذات میں ایک انجمن تھیں۔ انہوں نے بیک وقت باپ اور ماں بن کر ہم نو بہن بھائیوں کو اپنے سائے میں پروان چڑھایا۔

ہمارے والد محترم (سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ) کے حوالے سے ہمارا گھر ہر وقت لوگوں کی مسلسل آمد و رفت کا مرکز بنا رہتا تھا، باہر مرد حضرات اور اندر خواتین۔ ہم نے بچپن ہی سے اپنے گھر میں "جمعہ" ہوتا دیکھا تھا۔ گیارہ بجے سے گھر کے سب سے بڑے کمرے میں دری، چاندنی کا فرش بچھ جاتا تھا اور ہماری اماں جان صلوۃ التسبیح پڑھنے میں مشغول ہو جاتی تھیں۔ چونکہ یہ انفرادی عبادت ہے، اس لیے ہمارے گھر میں صلوۃ التسبیح کبھی با جماعت نہیں ہوئی۔ اسی اثنا میں دُور و نزدیک سے خواتین کی آمد شروع ہو جاتی تھی۔ جب جمعے کی نماز کا وقت ہو جاتا تو کمرہ خواتین سے تقریباً بھر چکا ہوتا۔ ہماری اماں جان نماز با جماعت پڑھاتیں۔ نماز کے بعد اجتماعی دُعا ہوتی تھی، اس کے بعد درس قرآن و حدیث۔ درس کے بعد دوبارہ دُعا ہوتی، جس کے بعد یہ اجتماع منتشر ہو جاتا تھا۔

اسی طرح ہمارے گھر میں عیدین کی نمازوں کا بھی اہتمام ہوتا تھا۔ ہماری اماں جان فجر کی نماز کے بعد تلبیہ پڑھتیں اور عید کی نماز کے لیے تیاری کرواتی تھیں۔ ابھی ہم دری، چاندنی کا فرش بچھا کر فارغ بھی نہیں ہوتے تھے کہ نماز عید کے لیے خواتین کی آمد شروع ہو جاتی تھی، جو صفیں باندھ کر بیٹھتی جاتی

تھیں، پھر سب مل کر تلبیہ پڑھتے تھے۔ سورج نکلتے ہی خواتین کو تکبیروں کے بارے میں ہدایات دی جاتی تھیں اور پھر اماں جان بڑی خوش الحانی سے سب کو نماز پڑھاتی تھیں۔ نماز کے بعد خطبہ ہوتا تھا۔ دُعا کے بعد سب کو سویاں کھلائی جاتی تھیں اور عید کی مبارک باد دیتی تھیں۔

جیسے ہی ذہن ماضی کی طرف لوٹتا ہے تو چشم تصور میں ایک منظر گھوم جاتا ہے۔ رات کا وقت ہے اور اماں جان، ہم چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنے ساتھ لگائے کھڑی ہیں۔ دولیڈی کانسٹیبل آگے بڑھتی ہیں۔ وہ اماں جان سے سوال و جواب کر رہی ہیں اور پورے گھر کی تلاشی بھی لے رہی ہیں۔ ابا جان کے کپڑے ایک سوٹ کیس میں رکھتے ہیں اور وہ تیار ہو کر کہیں جانے کو کھڑے ہیں۔ پھر یک دم ابا جان پیچھے مڑ کر ہماری طرف دیکھے بغیر قدرے بلند آواز میں السلام علیکم، خدا حافظ، فی امان اللہ کہتے ہیں اور پولیس والوں کے ساتھ روانہ ہو جاتے ہیں۔

یہ پہلی گرفتاری تھی جو 4 اکتوبر 1948ء کو ہوئی۔ اس وقت میری عمر آٹھ سال تھی۔ بعد میں، میں نے اماں جان سے پوچھا: ”ابا جان نے جاتے وقت ہماری طرف مڑ کر دیکھا کیوں نہیں تھا؟“ اماں جان نے بڑے اطمینان سے کہا: ”حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تو مکے سے جاتے وقت حضرت ہاجرہ علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے سے ارادے اور عزم میں کمزوری آتی ہے۔ اماں جان ہمیں انبیا علیہم السلام کے قصے سناتی رہتی تھیں، اس لیے بات میں پوشیدہ سبق سمجھنے کے لیے اتنا اشارا ہی کافی تھا۔

جب ابا جان گرفتار ہوئے تو اس وقت گھر میں بہت تھوڑے سے پیسے تھے۔ اس لیے ہماری اماں جان نے زندگی کے تمام معمولات بدل دیے۔ دھوبی کو کپڑے دینے بند کر کے انہوں نے خود کپڑے دھونے شروع کر دیے۔ ملازم کو فارغ کر کے کھانا خود پکانا شروع کر دیا۔ ان دنوں ایک مائی جو اچھرہ سے جمعہ پڑھنے ہمارے ہاں آیا کرتی تھی وہ اور ایک تانگے بان کی بیوہ بہن تھی، اصرار کر کے ہمارے ہاں آ گئی اور سارے کام سنبھال لیے، کپڑے دھونے شروع کر دیے، وہ آٹا گوندھ کر تنور سے روٹیاں لگوا کر لے آتی۔ اس نے اماں جان سے کہا: آپ اللہ تعالیٰ کے کام کریں، آپ کے گھر کے کام میں کروں گی۔ اس کا نام بھاگ بھری (قسمت والی) تھا۔ یہ نام چونکہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا، اس لیے ہم سب اسے ”رس بھری“ کہتے تھے جس کا اس نے کبھی برا نہیں مانا تھا۔

اماں جان ہر وقت یا حی یا قیوم برحمتک استغیث کا ورد کرتی رہتی تھیں۔ ایک مرتبہ دمے کا بہت شدید دورہ پڑا تو تکلیف کی شدت میں بس اتنا کہا: ”میرے میاں جیل میں ہیں، مجھے کچھ ہو گیا تو میرے بچے روئیں گے اور انہیں کوئی چپ کرانے والا بھی نہیں ہو گا۔“ دادی اماں یہ سن کر سخت ناراض ہوئیں: ”کیوں مایوسی کی باتیں کرتی ہو، حوصلہ کرو، کیا ہوا جو ذرا سا سانس اوپر نیچے ہو گیا۔“

دادی اماں بڑی حوصلے والی خاتون تھیں۔ وہ ہماری اماں جان کو نصیحت کیا کرتی تھیں: ”بچوں کو ایسی عادت ڈالو کہ سرد اور گرم ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کر سکیں۔ ایک وقت سونے کا نوالا کھلاؤ، موتی کوٹ کر کھلاؤ لیکن دوسرے وقت دال سے روٹی کھلاؤ، چٹنی سے روٹی کھلاؤ۔ بچوں کو کبھی ایک طرح کی عادت نہ ڈالو اور نہ ہر وقت ان کی منہ مانگی مراد پوری کرو۔ ماں باپ تو آسانی سے اولاد کی عادتیں خراب کر دیتے ہیں لیکن دنیا کوئی لحاظ نہیں کرتی۔ یہ تو بڑے بڑوں کو سیدھا کر دیتی ہے۔“ اور پھر کہتی تھیں: ”میں نے اپنے بچوں کو اسی طرح پالا ہے۔ ایک وقت اچھے سے اچھا کھلایا تو دوسرے وقت دال چٹنی سے روٹی کھلائی۔“

شاید یہی وجہ تھی کہ ہمارے ابا جان ہر طرح کے سرد، گرم حالات سے بڑی ثابت قدمی کے ساتھ گزر گئے اور ہر سختی اپنی جان پر جھیل گئے۔ وہ فولادی اعصاب کے مالک تھے۔ ٹوٹا ہوا بٹن خود ٹانک لیتے تھے۔ اپنا پھٹا ہوا کرتہ خود رفو کر لیتے تھے۔ پہلی گرفتاری کے بعد ان کی جیل کٹ (jail kit) ہر وقت

تیار رہتی تھی، اس میں سوئی دھاگا اور ہر سائز کے بٹن بھی ہوا کرتے تھے۔ ہم جب کبھی ابا جان سے ملاقات کرنے سنٹرل جیل ملتان جاتے، دادی اماں اس قدر لطیف پیرائے میں ہنسی خوشی کی باتیں کرتی تھیں کہ ہم اور اماں جان حیران رہ جاتے تھے کہ اسی برس کی ایک بیوہ ماں جیل میں بیٹے سے ملاقات کرنے آئی ہیں اور وہ بھی اتنے شگفتہ موڈ میں۔ یہی حال ہمارے ابا جان کا تھا۔ یہ باتیں اس وقت تو ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھیں لیکن بعد میں سمجھ میں آیا کہ دونوں ماں بیٹا چاہتے تھے کہ ہمارے بچے راہ حق کی تکلیفوں اور آزمائیشوں کو ہنسی خوشی جھیلنا سیکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ مشکلات سے برگشتہ ہو کر جہاد زندگانی سے منہ موڑ جائیں۔

یوں تقریباً ہر ملاقات میں ہم لوگ ہنسی خوشی جاتے تھے اور ہنسی خوشی واپس آتے تھے۔ جبکہ دیگر گھرانوں کے اکثر لوگ دکھی چہروں کے ساتھ جیل میں ملاقات کو آتے تھے اور روتے ہوئے واپس جاتے تھے۔ ایک مرتبہ سپرنٹنڈنٹ جیل نے حیرانی سے ابا جان سے پوچھا: ”میں نے جیل خانہ جات کی اپنی پوری ملازمت کے دوران میں کسی فیملی کو اتنا خوش باش نہیں دیکھا جتنا آپ کی فیملی کو دیکھا ہے، جبکہ آپ کی والدہ بڑی عمر کی ضعیف خاتون ہیں۔ اس میں راز کی بات بتائیں۔“ ابا جان نے انہیں یہی جواب دیا تھا: ”ہم نے اپنے بچوں کو زندگی کی تلخ حقیقتوں کا ہنس کر مقابلہ کرنا سکھایا ہے اور مجھے یہ تربیت میری انہی والدہ محترمہ ہی نے تو دی ہے اور یہی تربیت اب وہ اپنے پوتے پوتیوں کو دے رہی ہیں۔ پہلی گرفتاری کے دوران میں ملتان جیل سے اپنے بڑے بھائی جناب ابو الخیر مودودی کے نام خط میں ابا جان نے 16 مئی 1949ء کو لکھا تھا: ”اگر موسم اجازت دے تو اپنے ساتھ دونوں بڑے بچوں (عمر فاروق، احمد فاروق) کو بھی لے آئیں۔ پہلے میں نے اس لیے بچوں کو لانے سے منع کر رکھا تھا کہ بچوں کے ذہن پر یہاں کے ماحول کا برا اثر پڑنے کا اندیشہ تھا۔ مگر اب غور کرنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہیں یہ جگہ ضرور دکھانی چاہیے۔ کیا عجب کہ کل جو نسل اٹھنے والی ہے، وہ موجودہ نسل سے بھی زیادہ بگڑی ہوئی ہو اور اس کے مقابلے میں ان لوگوں کو ہم سے بھی زیادہ سخت جد و جہد کرنی پڑے۔ میں اپنی اولاد کو عیش کے لیے نہیں پالنا چاہتا بلکہ خیر کی خدمت اور شر سے جنگ کے لیے پالنا چاہتا ہوں۔“

6ـ خطوط مودودی، دوم، صفحہ 337۔

ہماری دادی اماں، ایک ولی اللہ خاتون تھیں۔ وہ جب بیمار ہوتیں تو آسمان کی طرف نظریں اُٹھا کر بڑے جذبے کے ساتھ دُعا اور التجا کرتے ہوئے کہتی تھیں: **من مریضم تو طبیبم** اور پھر وہ ٹھیک ہو جاتی تھیں۔ زندگی بھر ڈاکٹر کو نہیں دکھایا اور نہ کبھی دوا پی۔ اگر کبھی پھوڑا پھنسی نکل آتا تو اس جگہ ہاتھ رکھ کر کہتی تھیں: ”اے دنبل، بزرگ مشو، خدائے ما بزرگ تر است (اے پھوڑے زیادہ نہ بڑھ، ہمارا اللہ سب سے بڑا ہے)۔ یہ کہنے سے وہ پھوڑا ٹھیک ہو جاتا تھا۔ وہ فارسی زبان و ادب کی اسکالر تھیں اور اکثر بات کا جواب فارسی اشعار میں دیا کرتی تھیں۔

دادی اماں جس محفل میں بھی بیٹھتی تھیں، خواہ وہ کتنی ہی بڑی محفل ہوتی، ان کے ہوتے ہوئے کوئی دوسری خاتون بول نہیں سکتی تھی۔ بس، سب ان کی باتیں سنتے تھے اور انہی کو دیکھتے تھے۔ وہ ہر محفل کی جان ہوتی تھیں۔ گفتگو اس قدر ادبی اور دل چسپ پیرائے میں کرتی تھیں کہ اگر کوئی ایک بار ان سے مل لیتا تھا تو ان کو اور ان کی باتوں کو کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ غضب کی حاضر جواب تھیں۔ ایسی بر جستہ بات کہتی تھیں کہ سننے والوں کے دل پر وہ بات نقش ہو جاتی تھی۔ ایسی خوش گفتار اور بذلہ سنج خاتون تھیں کہ سب کو ہنسائی تھیں لیکن خود سنجیدہ رہتی تھیں۔ اس پر ہم لوگوں کو اور زیادہ ہنسی آتی تھی کہ خود کیسے سوکھا سا منہ بنائے رکھتی ہیں اور ہمیں ہنسا ہنسا کر ہمارا برا حال کر دیتی ہیں۔

ہمارے ماموں جلال الدین شمسی صاحب ان دنوں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور میں پڑھتے تھے۔ انہوں نے ایک روز دادی اماں سے شرط لگا دی کہ ہم دونوں نثر میں نہیں بلکہ شعر میں بات کیا کریں گے۔ اب دادی اماں کو تو کسی سے مدد لینے کی ضرورت نہ پڑی لیکن ہمارے ماموں بار بار ہماری اماں جان

کے پاس شعر پوچھنے کے لیے آنے لگے، یا یہ کہتے: "ایک مصرع یاد ہے، خطرہ ہے کہ آدھے شعر پر دادی اماں ہرگز نہ بخشیں گی اور نہ غلط شعر پڑھنے پر ہی معاف کریں گی۔" مشکل یہ آن پڑی کہ اگر اماں جان، ہمارے ماموں کی مدد کرتیں تو یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی۔ چنانچہ اماں جان نے دادی اماں سے اجازت مانگی: "کیا میں جلال میاں کی کچھ مدد کر دوں؟" دادی اماں نے بخوشی اجازت دے دی: "بچہ ہے، اگر رہنمائی چاہتا ہے تو کوئی بات نہیں لیکن اس کے باوجود ایک ہفتے کے اندر اندر جلال ماموں شرط ہار گئے اور اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہنے لگے، دادی اماں سے آئندہ ایسی شرط نہیں لگاؤں گا۔

اماں جان کہتی تھیں: "میں نے اپنی پوری زندگی میں تمھاری دادی اماں جیسی کوئی دوسری عورت نہیں دیکھی کہ جس میں سرے سے نفس ہی نہ ہو۔ انہیں کسی چیز کی طلب ہی نہیں تھی۔" دادی اماں کہا کرتی تھیں: "صوفیا کی یہ صفت ہے کہ وہ کسی کو منع نہیں کرتے، طمع نہیں کرتے اور جمع نہیں کرتے۔" اتفاق سے یہ تینوں صفات ہماری دادی اماں، ابا جان اور اماں جان میں موجود تھیں۔ رضا بہ قضا اور صبر جیسی اعلیٰ صفات کی ان تینوں ہستیوں نے اپنے اندر اس طرح سے پرورش کی تھی کہ وہ نفس مطمئنہ کا بہترین نمونہ بن گئے تھے۔

اماں جان یہ ذکر کیا کرتی تھیں: "میں نے جینے کا سلیقہ تمھاری دادی اماں سے سیکھا ہے۔" حیرت کی بات یہ تھی کہ ساس بہو، دونوں ہمیشہ ایک ہی رائے رکھتی تھیں اور کبھی آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا تھا۔ جب ابا جان پہلی مرتبہ جیل گئے اور ہاتھ بالکل تنگ ہو گیا تو اماں جان نے فیصلہ کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے بچوں کی تعلیم جاری رہنی چاہیے۔ اماں جان کی ایک نہایت مخلص دوست خورشید خالہ، جب ان سے ملنے آئیں تو اماں جان نے اپنا کچھ زیور انہیں دیتے ہوئے کہا کہ اسے فروخت کر لائیں۔ اس طرح وہ بچوں کی تعلیم اور گھر کے اخراجات بڑی جز رسی کے ساتھ اور بہت سنبھل سنبھل کر پورے کرتی تھیں۔

عید بقر عید یا عزیزوں کے ہاں شادی بیاہ پر نئے کپڑے بنوانے کا رواج ہمارے گھر میں بالکل نہیں تھا۔ اماں جان نے ہمیں سمجھا دیا تھا: "رمضان میں چونکہ زکوٰۃ ادا کرنی ہوتی ہے، اس لیے عید الفطر پر نئے کپڑے نہیں بنائے جا سکتے اور بقر عید پر قربانی دینی ہوتی ہے، اس لیے نئے کپڑوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے دھوبی کے دھلے ہوئے کپڑے پہنو اور عید کی نماز پڑھنے چلے جاؤ۔ اسی طرح ہر شادی میں نئے کپڑوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آج کل، جب اس طرح کی خبریں اخبار میں نظر سے گزرتی ہیں کہ ایک ماں نے خود کو آگ لگا کر خود کشی کر لی کیوں کہ اس کے بچوں کے لیے عید کے نئے کپڑوں کا انتظام نہیں ہو سکا تھا یا باپ نے خود کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا لیا کہ وہ عید پر بچوں کی فرمائشیں پوری نہیں کر سکتا تھا تو بہت حیرت ہوتی ہے۔

ایک بار گھر میں آٹا ختم ہو گیا۔ شام کا وقت تھا اور آٹا پینے کی چکی بھی بند ہو چکی تھی۔ ہماری ملازمہ کریم بی بی، ہمسائے کے گھر سے، عاریتاً آٹا مانگ کر لے آئیں۔ یہ دیکھ کر اماں جان سخت خفا ہوئیں: "بہن تو نے یہ کیا کیا؟

کریم بی بی کہنے لگی: بی بی جی، وہ بھی ہم سے کئی بار آٹا مانگ لیتے ہیں اور جب ان کا آٹا پس کر آ جاتا ہے تو وہ واپس دے جاتے ہیں۔ کل جب ہمارا آٹا پس کر آ جائے گا تو میں بھی انہیں واپس دے آؤں گی۔

لیکن اماں جان نے کہا: "ان کی بات اور ہے۔ وہ جتنا چاہیں دوسروں سے ادھار آٹا لیں مگر ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ لوگ کہیں گے کہ مولانا صاحب جیل میں ہیں اور ان کے گھر والے ہمسایوں سے مانگ مانگ کر کھا رہے ہیں۔ اگر گھر پہ آٹا نہیں تھا تو ہم کسی بھی طرح گزارا کر لیتے، کھچڑی پکا لیتے، روکھی سوکھی کھا لیتے مگر تمہیں یوں ادھار مانگنے نہیں جانا چاہیے تھا۔ ایسی سرزنش کی گئی کہ اس نے دوبارہ خطا نہ کی۔"

بہر حال اللہ تعالیٰ کی مدد سے وہ مشکل وقت بھی گزر ہی گیا اور 28 مئی 1950ء کو 19 ماہ اور 25 دن کی نظر بندی کے بعد ابا جان پھولوں کے ہاروں سے لدے پھندے گھر آ گئے اور سارا گھر مبارک باد دینے والوں سے بھر گیا۔

---

28 مارچ 1953ء کو ابا جان دوبارہ مارشل لا کے تحت گرفتار کر لیے گئے۔ پھر وہی تھوڑے سے پیسے تھے اور چھوٹے چھوٹے آٹھ بچوں کے ساتھ دمے کی مریضہ، انتہائی کمزور صحت والی اماں جان تھیں، جنہوں نے بڑے حوصلے سے ان حالات کا مقابلہ کیا۔ کبھی چوڑی اور کبھی انگوٹھی بیچنے کا سلسلہ جاری رہا (یہ کام خورشید خالہ مرحومہ انجام دیتی تھیں)۔ حسب سابق خود کھانا پکانا اور گھر کے سارے کام کرنے شروع کر دیے۔ اس مرتبہ مارشل لا کے تحت فوجی عدالت میں ابا جان پر مقدمہ چل رہا تھا۔ یہ مقدمہ ایک پمفلٹ ”قادیانی مسئلہ“ لکھنے کے سلسلے میں چل رہا تھا۔ 9 مئی 1953ء کو مقدمے کی کاروائی مکمل ہو گئی۔ یہ 11 مئی 1953ء کی صبح تھی، جب اماں جان ناشتا بنا رہی تھیں اور ہم سب بچے اسکول جانے کے لیے تیار ہو کر ناشتے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اسی دوران میں یکدم ہمارے بڑے بھائی عمر فاروق صاحب ہاتھ میں اخبار لیے بڑے گھبرائے ہوئے اندر آئے اور اماں جان کو ایک طرف لے جا کر اخبار دکھایا۔ اس اخبار میں نہ جانے کیا تھا کہ اسے دیکھتے ہی اماں جان کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ تاہم دوسرے ہی لمحے انہوں نے اخبار چھپا دیا اور ایک لفظ کہے بغیر، ہمارے لیے اسی دل جمعی اور اسی رفتار سے پراٹھے بنانے شروع کر دیے جیسے وہ پہلے بنا رہی تھیں۔ پھر ہم سب کو ناشتا کروا کر اسکول روانہ کر دیا اور اندر جا کر عمر بھائی کو بھی اسکول جانے کی ہدایت کی۔ اندر سے عمر بھائی کی آواز آئی: ”نہیں اماں مجھ سے اسکول نہیں جایا جائے گا۔ دوسرے بھائی احمد فاروق گھر سے کچھ دُور ہی گئے تھے کہ ایک ہاکر زور زور سے اعلان کر رہا تھا: ”مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔“ وہ تو اپنا اخبار بیچنے کے لیے آواز لگا رہا تھا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے سامنے سے جو بچہ یونیفارم پہنے اپنے اسکول جا رہا ہے، یہ اسی کے باپ کو پھانسی دینے کا اعلان ہے۔ چنانچہ احمد فاروق بھائی بھی آدھے راستے ہی سے واپس آ گئے۔

میں اور اسما اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلے ہی تھے تو ہاکروں کی صدائیں کان میں پڑیں: مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ عمر بھائی اخبار ہاتھ میں لیے کیوں گھبرائے ہوئے اماں جان کے پاس آئے تھے اور اس اخبار میں کیا تھا، جسے دیکھتے ہی اماں جان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا لیکن اس کے باوجود ہم دونوں بہنیں گھر واپس نہیں آئیں، بلکہ سیدھی اسکول چلی گئیں۔

ہم 60 فیروز پور روڈ والے سرکاری اسکول میں پڑھتیں اور گھر سے پیدل جاتی تھیں۔ اسکول میں ہمیں جو بھی دیکھتا، حیران رہ جاتا تھا۔ ہماری ہیڈ مسٹریس صاحبہ ایک مسیحی خاتون تھیں۔ انہوں نے جب اسکول اسمبلی میں ہمیں دیکھا تو تقریر کرتے ہوئے طالبات سے اچانک یہ کہا: دیکھو، رہنما ایسے ہوتے ہیں کہ باپ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی ہے اور بیٹیاں صاف ستھرے یونیفارم پہنے اسمبلی میں بالکل پرسکون کھڑی ہیں۔ شاباش اس ماں کو ہے، جس نے ایسے دن اور ایسے موقعے پر بھی اپنی بچیوں کو صاف کپڑے پہنا کر، بال بنا کر کھلا پلا کر اسکول روانہ کر دیا ہے۔ یہ لڑکیوں کا کمال نہیں ہے، یہ تو ان کی ماں کی عظمت ہے کہ انہوں نے آج بھی اپنی بچیوں کی تعلیم کو ضروری جانا۔ کوئی اور جاہل عورت ہوتی تو اس نے رو رو کر اور بین کر کر کے سارا محلہ سر پر اٹھایا ہوا ہوتا۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ نے یہ بھی کہا۔ عام لوگوں اور لیڈروں میں یہی فرق ہوتا ہے۔ اس وقت میں نویں جماعت میں تھی اور اسما ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی۔

وہ ہیڈ مسٹریس صاحبہ تو مسیحی تھیں اور ایسی باتیں کر رہی تھیں، جب کہ ہماری دوسری اسکول ٹیچرز جو مسلمان تھیں، کہہ رہی تھیں: یہ کہاں سے لیڈر بن گئے یہ تو غدار ہیں، پاکستان کی مخالفت کرنے والے۔ لڑکیاں بھی دیکھو کتنی مکار ہیں، یہ سب ایکٹنگ ہے، چالاک ماں کی چالاک بیٹیاں!“

اسکول سے واپس جب ہم اپنے گھر 5 اے، ذیلدار پارک آئے تو منظر ہی دوسرا تھا۔ پوری گلی لوگوں سے پر ہجوم تھی۔ دُور دُور تک بسیں کھڑی تھیں جن میں سوار ہو کر لوگ دوسرے شہروں سے آ گئے تھے، ہم دونوں بہنیں گلی سے گزر کر گھر کے دروازے تک بمشکل پہنچ پائیں۔ جبکہ دروازے سے گھر کے اندر داخل ہونا مشکل تر ہو گیا۔ کچھ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور کچھ خاموشی سے آنسو بہا رہے تھے۔ ایسے میں جب انہوں نے ہمیں خاموشی سے بستے اٹھائے اسکول سے گھر آتے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ انہوں نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور کہا: "جب مولانا کے بچے نہیں رو رہے اور صبر و سکون کے ساتھ حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں تو ہم روتے اور بے صبر ہوتے کیا اچھے لگتے ہیں۔" کچھ لوگوں نے کہا: "صبر تو اس کو کہتے ہیں۔"

بڑی مشکل اور ہجوم میں سے گزر کر جوں ہی ہم گھر کے اندر پہنچے تو پورا گھر خواتین سے پٹا پڑا تھا، تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ جو خواتین اس دن ہمارے گھر اظہار ہمدردی کے لیے آئی تھیں، رو رہی تھیں۔ اماں جان ان کو صبر کی تلقین کر رہی تھیں اور یہی حال ہماری دادی اماں کا بھی تھا۔ جب ہم کو دیکھا تو اماں جان نے بس اتنا کہا: "بیٹا گھبرانا نہیں، صبر کرنا۔"

اور پھر ہم سب کو اپنے ہاتھ سے پکایا ہوا کھانا کھلایا اور جا کر خواتین میں بیٹھ گئیں۔ اس روز ایک خاتون نے اماں جان سے کہا تھا: "بیگم صاحبہ، آج رات آپ ایک سو نفل حاجت کے لیے پڑھیں اور پھر تہجد کے نفل پڑھ کر مولانا صاحب کی زندگی، سلامتی اور بقا کے لیے دعا کر کے یہ منت مانیں کہ جب سلامتی اور خیر و عافیت سے گھر واپس آئیں گے تو پھر میں اسی طرح ایک سو نفل شکرانے کے ادا کروں گی۔ غرض وہ ساری رات اماں جان نے نفل پڑھتے ہوئے گزاری۔ رات کو میں نے جب بھی دیکھا (ایسی ہولناک رات میں بھلا نیند کسے آنی تھی) انہیں جائے نماز پر، بہ چشم تر نفل پڑھتے ہوئے پایا۔

فجر کی اذان سنتے ہی ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ فجر کی نماز کے بعد اماں جان نے تلاوت کے لیے قرآن کھولا اور وہی سلسلہ جہاں سے روز پڑھتی تھیں، پڑھنا شروع کیا۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ جو آیت ان کے سامنے آئی وہ یہ تھی:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔ (سورۃ البقرۃ 2: آیۃ 214)

(ترجمہ) پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی تمہیں جنت میں داخلہ مل جائے گا؟ حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، وہ ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں، اللہ کی مدد قریب ہے۔

اس آیت کو اماں جان پڑھتی گئیں اور روتی گئیں۔ پھر مجھے بلایا اور یہ آیت دکھائی، پھر کہنے لگیں:

دیکھو، یہ زندہ کتاب ہے، یہ انسان کی دکھتی رَگ پکڑتی ہے۔ یہ دل کا چور پکڑتی ہے۔ یہ دکھی انسان کے زخموں پر مرہم رکھتی ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ تم اس سے دوستی کر لو! پھر یہ تمہارے حالات کے مطابق تمہاری دلی کیفیت کے مطابق، تم سے معاملہ کرے گی، تمہیں مشورہ دے گی، تمہیں تسلی دے گی، اب دیکھو عین ہمارے حالات اور ہماری دلی کیفیت کے مطابق ہمیں کیسے تسلی دے رہی ہے، کیسے ہمارے زخموں پر مرہم رکھ رہی ہے!

اس وقت میری عمر 13 برس تھی۔ شاید سب سے بڑی بیٹی ایک طرح سے والدہ کی چھوٹی بہن یا سہیلی کی مانند ہوتی ہے، اس لیے اماں جان اکثر دل کی باتیں مجھ سے کرتی تھیں۔ مشورہ بھی مجھ سے لیتی تھیں اور میں ہی ان کی راز دار تھی۔ مجھ پر انہیں بڑا اعتماد تھا۔

لیکن اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ اس وقت میرے بچپن میں جو باتیں وہ مجھ سے کرتی تھیں، وہ ایک طرح کی خود کلامی ہوتی تھی۔ وہ ایسی باتیں تھیں جو وہ کسی اور سے نہیں کر سکتی تھیں ۔ اکثر کہا کرتی تھیں کہ بد قسمت وہ ہے جس کی بیٹی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تینوں بیٹیوں کو جن نازوں سے پالا پوسا اور پڑھایا لکھایا، وہ بیٹوں کو نہیں نصیب ہوا۔

بعد میں ابا جان بھی اکثر اپنے دل کی بات مجھ سے اور اسما بہن ہی سے کرتے تھے! پھر سارا دن اماں جان مطمئن رہیں۔ وہ بار بار اس آیت کا ورد کرتی رہیں اور کہتی رہیں: ''ویسے تو سارے ہی قرآن پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے کہ اس نے ایسی زندہ کتاب ہم کو عطا فرمائی لیکن اس آیت کا ہم سب پر بہت ہی بڑا احسان ہے کہ اس نے ایسے نازک وقت میں ہمیں توصلہ دیا، بشارت دی اور ہماری دست گیری کی۔''

دوسری رات بھی آئی اور گزر گئی۔ اماں جان مطمئن رہیں، باہر مردوں سے اور اندر عورتوں سے گھر بھرا رہا۔ عورتیں روتی ہوئی آتی تھیں مگر اندر آکر جب اماں جان اور دادی اماں کا صبر دیکھتیں تو خاموش ہو جاتیں اور ایک دوسرے سے کہتی تھیں اس کو کہتے ہیں صبر! ابا جان کو سنائی جانے والی سزائے موت کے خلاف ملک بھر میں احتجاجی مظاہروں، ہڑتالوں اور سزا کی منسوخی کے مطالبات کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ مسلم ممالک ہی نہیں، بہت سے غیر مسلم ممالک کے مسلمانوں کی طرف سے بھی گورنر جنرل اور وزیر اعظم کے نام برقی تار بارش کی طرح برس رہے تھے۔ رد عمل انتہائی وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ 13 مئی کو اماں جان نماز عصر سے ابھی فارغ ہی ہوئی تھیں کہ جماعت اسلامی کے ایک کارکن آئے اور انہوں نے پیغام بھجوایا: ''بیگم صاحبہ کو دروازے کے پاس بلائیے۔'' ہم سب ڈر گئے کہ پتا نہیں کیسی خبر ہے؟ اماں جان بھی بڑی گھبرائی ہوئی دروازے پر آئیں کہ ہم سب کو یک دم دروازے کے پیچھے سے آواز آئی: ''بیگم صاحبہ مبارک ہو! مولانا کی سزائے موت 14 سال قید با مشقت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کے خلاف ایک بیان جاری کرنے کے جرم میں سات سال مزید قید با مشقت کی سزا سنائی گئی ہے۔ وہ صاحب تو اپنی کہے جا رہے تھے، ادھر اماں جان پہلا جملہ ہی سن کر، اسی لمحے کھڑے قد سے سجدے میں گر گئیں۔ اماں جان کو سجدے میں دیکھ کر ہم بچے بھی سجدے میں گر گئے۔

اب تو گھر کا ماحول ہی بدل گیا۔

سب طرف سے مبارک سلامت شروع ہو گئی۔ یہ کسی نے سوچا ہی نہیں کہ آگے 21 سال کی قید ہے! اماں جان بار بار کہہ رہی تھیں: ''اللہ کا وعدہ سچا ہے، اَلَآ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ (سورۃ البقرہ 2: آیۃ 214) (ترجمہ) ہاں، اللہ کی مدد قریب ہے۔ پھر کہتیں: ''دیکھو، آیتیں اور حدیثیں خود اپنا مطلب سمجھا رہی ہیں کہ ہم ان حالات کے لیے ہیں اور یہ ہمارا مطلب ہے۔'' اس روز اماں جان نے ہم کو ایک خواب سنایا، جو ابا جان کو فوجی عدالت سے سزائے موت سنائے جانے سے صرف ایک دن پہلے انہوں نے دیکھا تھا۔ کہنے لگیں: ''میں نے دیکھا کہ ایک ہوائی جہاز آکر اترا ہے اور اس میں تمہارے ابا جان ہم سب کو لے کر سوار ہو گئے ہیں۔ جہاز ہے کہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ آسمان کی طرف عمودی پرواز کر رہا ہے۔ مجھے سخت چکر آرہے ہیں اور بڑی گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ پھر یک لخت ہوائی جہاز کہیں اتر جاتا ہے اور تمہارے ابا جان میرا ہاتھ پکڑ کر، سہارا دے کر جہاز سے اُتار رہے ہیں۔ اُدھر میری جان پر بنی ہوئی ہے اور ادھر تمہارے ابا جان کی آواز آتی ہے: ذرا نیچے دیکھو تو سہی کہ تم کتنی بلندی پر آ گئی ہو۔ پھر میں نیچے دیکھتی ہوں تو واقعی لوگ سڑکوں پر بونوں کی طرح نظر آرہے ہیں اور بڑی بڑی اونچی عمارتیں کھلونوں کی طرح نظر آ رہی ہیں۔ اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔''

خواب سنا کر کہنے لگیں: ''آج اس خواب کی تعبیر سامنے آئی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ باری تعالیٰ کو جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھ سے حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرانا مقصود نہیں تھا، بلکہ باپ کو خلیل اللہ اور بیٹے کو ذبیح اللہ بنانا تھا، اسی طرح ہم گناہ گاروں کو بھی اس بھاری آزمائش سے بخیر و خوبی گزارنا مقصود تھا۔''

اسی طرح جب ابا جان کو سزائے موت سنائی گئی تو عبد القادر حسن صاحب کے ہفت روزہ افریشیا، لاہور (25 دسمبر 1975ء) میں سرگودھا کے میاں رحیم بخش نے روایت کیا: میں نے ایک خواب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا کرتے دیکھا تھا۔ ''یا اللہ رحم کر، مودودی میرے دین کا نام لینے والا ہے، تو اسے ابھی زندہ رکھ، وہ تیرے دین کا کام کر رہا ہے، خداوند رحم کر۔'' میاں رحیم بخش صاحب بیان کرتے ہیں کہ اچانک آواز آئی: ''اے محمدؐ! ہم نے تیری دُعا قبول کی۔'' اس کے بعد اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ یہ صبح کا وقت تھا اور موذن اللہ اکبر کی صدا دے رہا تھا۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا، پھر اچانک میری آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے اور میں بہت دیر تک سکتے کے عالم میں اپنی چارپائی پر بیٹھا رہا۔ اس خواب کی تعبیر جلد سامنے آئی کہ سزائے موت ختم ہونے کا اعلان ہو گیا۔ ایک مرتبہ کسی نے اماں جان سے کہا تھا: ''آپ کے درس قرآن و حدیث میں جو لطف آتا ہے، وہ کسی اور کے درس میں نہیں آتا۔

انہوں نے جواب دیا: ''از دل خیز دبر دل ریزد۔ ان آیات اور احادیث کا مطلب کوئی دوسرا اسی وقت جان سکتا ہے جب وہ ایسے حالات سے گزرے جیسے حالات سے ہم گزرے ہیں۔''

اماں جان اور دادی اماں کی یہ پوری کوشش ہوتی تھی کہ بچے خوش و خرم رہیں اور ان کی نفسیات پر کوئی بڑا اثر نہ پڑے۔ اماں جان کہتی تھیں: ''انسان کا بچپن خوشیوں سے بھرپور ہونا چاہیے اور اسے کبھی عدم تحفظ کا احساس نہ ہونے پائے کیونکہ کسی قسم کی محرومی اگر بچپن میں انسان کو ڈس لے تو یہ چیز اس کی شخصیت کو گہنا دیتی ہے۔ یہ تلخ یادیں پھر ساری زندگی آسیب کی طرح اس کا پیچھا کرتی ہیں۔ ہر بچے کو اپنے گھر میں ایک اہم فرد کی طرح کا احساس ہونا چاہیے، بلکہ VIP ہونے کا احساس ہونا چاہیے، تاکہ اس میں خود اعتمادی پیدا ہو سکے۔ انہیں یہ فکر کھائے جاتی تھی کہ: میرے بچے، بچپن ہی میں بوڑھے ہو گئے ہیں اور ان کا بچپنا چھن گیا ہے۔ اس کے ازالے کے لیے انہوں نے بڑے جتن کیے اور مختلف طریقوں سے ہمیں مصروف رکھا۔

ایک روز ملتان جیل سے ابا جان کا پیغام آیا: ہر بچہ مجھے الگ الگ خط لکھے۔ چنانچہ ہم سب نے انہیں الگ الگ خط لکھے۔ پھر ان خطوں کے جواب میں ابا جان نے ہم سب کو اپنے ہاتھ سے علیحدہ علیحدہ خط لکھے اور ہم میں سے ہر ایک کو ایک ایک چھوٹی سی تھیلی بھیجی۔ ابا جان کی نیلے رنگ کی ایک قمیص جو پرانی ہو چکی تھی، اسے کاٹ کر انہوں نے خود سوئی دھاگے سے تھیلیاں سی کر تیار کی تھیں۔ ان تھیلیوں میں چھلے ہوئے چلغوزے، بادام، کشمش، پستے اور اخروٹ بھرے ہوئے تھے۔ ہر تھیلی کے اوپر، آٹے کی لئی سے چسپاں کی ہوئی چٹ پر ہم میں سے ہر ایک کا نام لکھا ہوا تھا۔ کسی پر نور نظر، کسی پر جان پدر اور کسی پر جگر گوشہ لکھنے کے بعد بچے کا نام لکھا ہوا تھا۔

ان خطوں اور تھیلیوں میں کیا تھا کہ انہیں دیکھے بغیر دادی اماں تو بے ساختہ بلک بلک کر رو پڑیں، اماں جان کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ سارا دن خاموش رہیں۔ جیل سے آنے والی یہ چھوٹی چھوٹی تھیلیاں زبان حال سے اسی طرح بول رہی تھیں، جیسے کوئی جیتا جاگتا انسان آپ بیتی سنا رہا ہو۔ وہ جیل کی اداسی، تنہائی، بچوں سے دوری، گھر کی یاد اور معلوم نہیں کیا کیا بیان کر رہی تھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابا جان، عزم و ارادے کا کوہ گراں تھے لیکن وہ تھیلیاں جن پر جان پدر، گوشہ جگر اور نور نظر کی چٹیں لگی ہوئی تھیں، یہ بتا رہی تھیں کہ ارادے اور عزم کے اس پہاڑ کے اندر ایک دھڑکنے والا دل بھی ہے اور یہ اس دل کی مجسم دھڑکنیں ہیں۔ دوسری طرف یہ نور نظر، جان پدر اور جگر گوشے، اس وقت اتنے چھوٹے اور بے شعور تھے کہ جلدی جلدی اپنی اپنی تھیلی کھول کر خشک میوہ جات کے پھنکے مار گئے۔ انہوں نے اپنے بچپنے میں یہ سوچا بھی نہ کہ کسی محبت و الفت سے وہ چلغوزے، ابا جان نے اپنے ہاتھ سے چھیلے ہوں گے اور پھر کس محبت سے وہ تھیلیاں بنائی ہوں گی اور پھر کس پیار سے ہر بچے کا فرداً فرداً نام لکھا ہو گا۔ ہم بچوں نے تو اپنا کام کر کے قصہ تمام

کیا لیکن دادی اماں اور اماں جان نے وہ خالی تھیلیاں سنبھال کر رکھ لیں۔ اب خیال آتا ہے کہ کاش وہ تھیلی آج بھی میرے پاس ہوتی، جس پر ابا جان نے جان پدر کے بعد میرا نام لکھا تھا۔ وہ تو ایک انمول اثاثہ اور قیمتی یادگار تھی!

اماں جان نے ایک مرتبہ دادی اماں سے التجا کی: "آپ کسی کو بد دعا نہ دیں کہ آپ کی دعا اور بد دعا دونوں حرف بہ حرف لگتی ہیں۔" یہ وہ موقع تھا جب 1953ء میں ابا جان جیل میں تھے اور دادی اماں نے کہا تھا: "جس نے میرے بیٹے کو جیل میں سڑایا ہے، یا اللہ! تو اسے پلنگ پر ڈال کر ایسا سڑا کہ اس کا آدھا دھڑ گل جائے۔ اس کے چند ماہ بعد اخبارات میں خبر چھپی کہ پاکستان کے گورنر جنرل ملک غلام محمد کو فالج ہو گیا۔

آخر کار 29 اپریل 1955ء کو قانونی سقم کی بنا پر ابا جان 25 ماہ کی قید و بند کے بعد رہا ہو کر گھر آ گئے۔ وہ بڑا ہی مبارک دن تھا۔ ہمارا گھر پھولوں، ہاروں اور مٹھائیوں سے بھر گیا۔ ہر طرف سے مبارک، سلامت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ۔ سارا دن اسی خوشی اور مسرت کے عالم میں گزرا اور جب رات ہوئی تو ہم سب سونے کے لیے لیٹ گئے۔ خوشی اور تھکاوٹ کے مارے اس رات ہم بچوں نے نماز عشا بھی نہیں پڑھی کہ یکدم اماں جان کی آواز کانوں میں پڑی: "ذرا دیکھو ان کی بے شرمی، بجائے شکرانے کے نفل پڑھنے کے، انہوں نے فرض نماز بھی نہیں پڑھی۔ جب باپ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی تو یہ کیسے نفل پڑھ پڑھ کر دعائیں مانگ رہے تھے۔ اب نکل گیا مطلب، اب تھوڑی کبھی اللہ تعالیٰ سے واسطہ پڑتا ہے!" یہ سنتے ہی ہم اٹھے اور وضو کر کے نماز پڑھنے لگے۔ اس پوری رات اماں جان شکرانے کے نفل پڑھتی رہیں۔ انہوں نے سزائے موت والی رات جو منت مانی تھی (کہ جب میاں خیریت کے ساتھ گھر واپس آئیں گے تو جس طرح آج حاجت کے ایک سو نفل پڑھے ہیں، اسی طرح شکرانے کے ایک سو نفل پڑھوں گی) اس کو پورا کر رہی تھیں لیکن اس مرتبہ انہوں نے چائے کا تھرموس اپنے پاس رکھا ہوا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد چائے پیتی تھیں، جب کہ سزائے موت کی خبر سننے کی اس ہولناک رات میں بالکل چائے نہیں پی تھی۔

صبح کو اماں جان کہنے لگیں: "انسان واقعی کتنا ناشکرا ہے۔ جب میاں کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اور موت سامنے کھڑی نظر آ رہی تھی تو یہ ایک سو نفل بہت تھوڑے لگ رہے تھے ۔ نہ نیند آئی، نہ تھکاوٹ محسوس ہوئی، نہ طبیعت بوجھل ہوئی اور نہ دھیان ہی اِدھر اُدھر ہوا۔ جو الفاظ زبان سے نکل رہے تھے ، وہی دل سے بھی نکل رہے تھے۔ مگر بعد میں جھکتی تھی، دل پہلے جھک جاتا تھا لیکن کل رات کبھی نیند آتی تھی، کبھی تھکاوٹ محسوس ہوتی تھی اور کبھی سر میں درد ہوتا تھا۔ وہ "جذب اندروں" سرے سے نصیب ہی نہ ہوا جو اس مرتبہ ملا تھا۔" اس انسانی کمزوری کا ذکر کرنے کے ساتھ، اماں جان توبہ اور استغفار بھی کہہ رہی تھیں: "سچ ہے ہم اللہ تعالیٰ کی کسی ایک نعمت کا بھی شکر ادا نہیں کر سکتے، چاہے ساری عمر سجدے میں گرے رہیں۔"

ایک بار اماں جان نے بچوں کی شرارتوں سے تنگ آ کر ابا جان سے کہا: "کوئی باپ بھی اولاد کو اتنا لاڈ پیار نہیں کرتا، جتنا آپ کرتے ہیں۔ کبھی تو ان کی شان میں بھی گستاخی کیجیے، کبھی تو ڈانٹ ڈپٹ کر کے ان کی باز پرس کیجیے؟

اس پر ابا جان نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا: "تم کو کیا معلوم کہ جب میں جیل میں ہوتا ہوں تو ان کے لیے کتنا اداس ہوتا ہوں۔ میں ان کی صورتوں کو ترس جاتا ہوں، ان کی آوازیں سننے کے لیے تڑپ اٹھتا ہوں۔ جب میں 1953ء میں جیل گیا تھا تو میرے سب سے چھوٹے بیٹے خالد نے نیا نیا بولنا سیکھا تھا۔ جیل میں اس کی توتلی باتیں میرے کانوں میں گونجتی تھیں۔ میں محسوس کرتا تھا کہ میرا سب سے قیمتی اثاثہ چھن گیا ہے کہ جب کبھی میں جیل سے باہر آؤں گا تو خالد بڑا ہو چکا ہو گا اور اس کے بچپن کی وہ اسٹیج گزر چکی ہو گی۔ پھر تو وہ پکی پکی باتیں کرنے لگے گا۔ میں جیل میں اپنے تصور میں انہیں دیکھتا تھا اور ان سے باتیں کرتا تھا۔ اب تم کہتی ہو کہ میں انہیں ڈانٹ ڈپٹ کروں اور ڈراؤں دھمکاؤں! یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔"

پھر ایک اور موقعے پر ابا جان نے کہا تھا: "یہ اتنے سارے بچے تم کو آسانی سے، بغیر اللہ تعالیٰ سے دُعائیں مانگے مل گئے ہیں، اس لیے کہتی ہو کہ یہ مجھے تنگ کرتے ہیں۔ جن کو یہ نہیں ملے ہوتے، تم کیا جانو کہ وہ ان کو حاصل کرنے کے لیے کہاں کہاں جاتی ہیں، کیسا کیسا شرک کرتی ہیں اور کس کس جگہ جا کر اپنا ایمان گنواتی ہیں!" ابا جان تو یہ کہہ رہے تھے اور ہم بھی وہیں کان لگائے یہ باتیں سن رہے تھے، جس پر اماں جان بہت خفا ہوئیں: "آپ کی انہی باتوں کی وجہ سے یہ اتنے سر چڑھتے ہیں!"

ہم بچوں کے اصرار پر ایک روز ابا جان نے ہمیں جیل کے حالات بتائے: "جب مجھے لاہور سے ملتان جیل لے جایا گیا تو دوپہر کا وقت تھا۔ جو کمرہ دیا گیا تھا، اس میں چھت کا پنکھا نہیں تھا اور نلکے کی جگہ ہینڈ پمپ تھا۔ یہ اے کلاس قیدی کا کوارٹر تھا۔ "سی کلاس" کا ایک مشقتی (قیدی ملازم) دیا گیا تھا، جو بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ وہ تقریباً چالیس سال کا خوب تنومند آدمی تھا۔ پہلے تو اس نے مجھ کو غور سے دیکھا اور پھر یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ جلدی جلدی سامان سنبھالا۔ ہینڈ پمپ چلا کر غسل خانے میں پانی رکھا اور کہنے لگا: میاں جی، نہا لیجیے۔ میں غسل خانے سے نکلا تو دیکھا کہ پورے کمرے میں ریت بچھی ہوئی ہے اور اس پر پانی چھڑک کر، چارپائی بچھا کر بستر لگا دیا گیا ہے۔ میں نے پوچھا: "پہلے تو اس کمرے میں ریت نہیں تھی، یہ کیوں بچھائی ہے؟" تو وہ کہنے لگا: گرمی بہت ہے، میں اس ریت پر پانی ڈالتا رہوں گا، تا کہ کمرہ ٹھنڈا رہے اور آپ دوپہر کو آرام کر سکیں۔"

"جتنی دیر میں، میں نے ظہر کی نماز پڑھی، اتنی دیر میں اس نے کھانا تیار کر لیا اور بڑے سلیقے سے لا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ ساتھ میں بڑی معذرت کرتا رہا کہ مجھے آپ کے ذوق کے متعلق کچھ پتا نہیں ہے۔ بس جلدی میں جو ہو سکا، کر لیا ہے۔"

"پھر اس مشقتی نے یہ چیز نوٹ کر لی کہ میں کس وقت کون سی دوا لیتا ہوں۔ اس کے بعد وہ ناشتے کی، دوپہر کے وقت کھانے کی اور رات کو کھانے کی صحیح صحیح دوائیاں سامنے رکھ دیتا تھا۔ مجھے کبھی یہ کہنے کی ضرورت نہیں پیش آئی کہ صبح کے وقت کی دوا نہیں رکھی ہے۔ ابا جان نے بتایا: اس نے جیل میں میری ایسی خدمت کی اور اس محبت سے خدمت کی کہ میں حیران رہ جاتا تھا۔"

ایک دن اس مشقتی نے مجھ کو یہ بتایا: "جب آپ کے ساتھ میری ڈیوٹی لگائی گئی تھی تو مجھے بتایا گیا تھا کہ ایک نہایت خطرناک قیدی آ رہا ہے، جس نے حکومت کو سخت پریشان کر رکھا ہے! اس کو راہ راست پر لانا ہے۔ اس کو اتنا تنگ کرو کہ خاموشی سے معافی نامے پر دستخط کر دے اور حکومت جو شرائط منوانا چاہے مان لے، بس تمھارا کام اسے ہر طرح سے تنگ کرنا ہے۔ کھانا اتنا بد مزہ پکانا کہ زبان پر نہ رکھا جائے۔ بس جی، میں یہاں بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ذرا دیکھوں تو سہی کہ آج کس شخص سے پالا پڑتا ہے؟ آخر میں بھی جرائم پیشہ آدمی ہوں کسی سے کم تو نہیں ہوں! پھر جب آپ اندر آئے تو میں آپ کو دیکھ کر بس سوچتا ہی رہا کہ بھلا آپ جیسے شخص سے بھی کسی کو کوئی خطرہ ہو سکتا ہے؟ میاں جی، آپ کو دیکھتے ہی پہلی نظر میں آپ کی محبت نے میرے دل میں گھر کر لیا۔"

پھر ایک روز سپرنٹنڈنٹ جیل آئے اور پوچھا: "کوئی شکایت ہو تو بتائیں۔" میں نے کہا: "مجھے تو کوئی شکایت نہیں ہے، میں بالکل آرام سے ہوں۔" سپرنٹنڈنٹ جیل دوسرے تیسرے دن آتے رہے اور یہی سوال پوچھتے رہے۔ آخر ایک روز پوچھ ہی لیا: "آپ یا تو تکلفاً یہ کہہ رہے ہیں یا پھر صحیح بات نہیں بتا رہے۔ میں نے کہا: "بھائی، اگر کبھی کوئی تکلیف ہوئی تو بلا جھجک آپ کو بتا دوں گا، فی الحال کوئی تکلیف نہیں ہے۔" اس پر سپرنٹنڈنٹ جیل نے کہا: "فلاں فلاں لیڈر اور سیاست دان حضرات اسی جیل کے اس کوارٹر میں صرف تین دن میں معافی نامے پر دستخط کر کے چلے گئے تھے، یہ معافی نامے حکومت کی فائلوں میں محفوظ رہتے ہیں اور جب یہ حضرات ذرا زیادہ ہی بڑھ بڑھ کر بولتے، تقریریں کرتے اور بیانات داغتے ہیں تو ان کو صرف ایک اشارہ کافی ہوتا ہے کہ آپ کا معافی نامہ کل کے اخبارات میں چھپوا دیا جائے گا۔ اتنا سنتے ہی ان کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔ ایک صاحب تو دو ہی دن میں رو رو کر معافیاں

مانگ کر یہاں سے چلے گئے۔ آپ کسی قسم کے آدمی ہیں کہ بڑے خوش بیٹھے نظر آ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں بالکل آرام سے ہوں۔" اس پر میں انہیں سمجھایا: "بھائی، جب زندگی ایک خاص مقصد کے حصول کے لیے گزاری جاتی ہے تو پھر یہ گرمی، سردی یا جیل کی کال کوٹھڑی جیسی منزلیں بالکل ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ میں نے یہ راستہ خوب سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ بیش از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی کے مصداق ذاتی آرام اور تکلیف سے میں بے نیاز ہو چکا ہوں۔" سپرنٹنڈنٹ صاحب پھر مشورہ دینے لگے: "آخر آپ اپنے آٹھ بچوں کو کس بات کی سزا دے رہے ہیں، ان کے بارے میں بھی تو کچھ سوچیے۔ میں نے جواب دیا: "بچوں کو تو میں اللہ تعالیٰ کے سپرد کر آیا ہوں، اب وہ جانے اور بچے جانیں، ان کی طرف سے میں ہرگز فکر مند نہیں ہوں:

کارساز ما بفکر کار ما

فکر ما در کار ما، آزار ما

(ترجمہ) ہمارا کارساز، دن رات ہمارے کام بنانے میں لگا ہوا ہے، جب ہم اپنی فکر خود کرتے ہیں تو یہ ہماری جان کا آزار ہوتا ہے۔

یہ سن کر سپرنٹنڈنٹ صاحب مایوس ہو کر چلے گئے۔ یوں معافی نامے پر دستخط کرانے کی ہمدردانہ کوششیں ناکام ہو گئیں۔

پھر ابا جان نے بتایا: "جب میں تفہیم القرآن لکھنے میں مصروف ہوتا تھا یا جب میں نماز پڑھ رہا ہوتا تھا تو مجھے محسوس ہوتا کہ وہ مشققی (قیدی ملازم) ٹکٹکی لگائے مجھے دیکھتا رہتا ہے۔ کچھ عرصے بعد بقر عید آ گئی۔ اتفاق سے جو راشن جیل سے دیا جاتا تھا، وہ بھی ختم ہو چکا تھا اور مزید راشن ابھی پہنچا نہیں تھا کہ عید کی چھٹیاں شروع ہو گئیں، یہاں تک کہ عید کی صبح کو راشن بالکل ختم ہو چکا تھا۔ وہ سخت پریشان تھا کہ راشن پہنچا نہیں، اب آپ کو ناشتا کیسے دوں؟ یہاں تک بات کرتے کرتے اور میرے منع کرتے کرتے اس کے منہ سے جیل انتظامیہ کے لیے ایک دو سخت قسم کی مغلظات نکل چکی تھیں۔"

میں نے اس سے کہا: "رات کو جو چنے کی دال اور روٹی بچی تھی، وہی گرم کر کے لے آؤ۔" کہنے لگا: "وہ تو میں آپ کو کبھی نہیں دوں گا! بھلا عید کے دن بھی کوئی رات کی باسی دال روٹی کھاتا ہے؟" میں نے اسے سمجھایا: "بھائی، میری فکر نہ کرو، میں بڑی خوشی سے دال روٹی کھالوں گا، (چونکہ ابا جان صبح آٹھ بجے ناشتا کرنے کے عادی تھے اور اپنے معمولات میں وقت کے سخت پابند تھے، اس لیے انہوں نے آرام سے دال روٹی کا ناشتا کر لیا۔ یہاں پر دادی اماں کی تربیت رنگ لا رہی تھی جو انہیں کبھی سونے کا نوالا کھلاتی تھیں اور کبھی چٹنی روٹی)۔ جس وقت میں ناشتا کر رہا تھا تو کسی کے سسکیاں بھر کر رونے کی آواز آئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہی مشققی بیٹھا رو رہا تھا۔ پوچھا: " بال بچے یاد آ رہے ہیں؟" کہنے لگا: "میں تو آپ کو دال روٹی کھاتے دیکھ کر رو رہا ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ عید کے دن، رات کی باسی دال روٹی تو ہم غریبوں نے بھی کبھی نہیں کھائی۔ آپ نے بھلا کہاں کھائی ہو گی؟"

میں نے اسے شفقت سے سمجھایا: "دیکھو بھائی، یہ راستہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے اور میں بڑی خوشی سے اس راہ پر چل رہا ہوں۔ اگر کبھی بالکل بھوکا بھی رہنا پڑا تو ان شاء اللہ میں آرام سے رہ لوں گا۔ تم میری وجہ سے رنجیدہ نہ ہوا کرو۔"

ابا جان نے مزید بتایا: "میں تو ناشتا کر کے یکسوئی سے تفہیم القرآن لکھنے بیٹھ گیا لیکن اس بے چارے مشققی نے احتجاجاً ناشتا نہ کیا (اگرچہ اس کے لیے بھی وہی دال روٹی موجود تھی)۔ اتنے میں کوارٹر کا دروازہ زور زور سے کھٹکنے کی آواز آئی۔ مشققی نے دروازہ کھولا تو جیل کا چوکیدار کئی ناشتے دان، بڑے بڑے پیکٹ اور گٹھڑیاں اٹھائے کھڑا کہہ رہا تھا: "مولانا صاحب، آپ کے چاہنے والے تو فجر کے وقت ہی یہ چیزیں لے آئے تھے اور جیل کے دروازے پر کھڑے

تھے لیکن سپرنٹنڈنٹ صاحب کا دفتر عید کی نماز کے بعد کھلا۔ اس کے بعد ان چیزوں کی تلاشی اور جانچ پڑتال ہوئی، اس لیے آپ تک پہنچانے میں دیر لگ گئی۔"

اب جو قیدی ملازم نے وہ پیکٹ، ناشتے دان اور گٹھڑیاں کھولیں تو ان میں انواع و اقسام کی نعمتیں تھیں۔ میں نے اپنے جیل کے اس ساتھی سے کہا: "دیکھو، یہ سب تمہارے لیے آیا ہے، کیونکہ تم ہی اداسی میں بھوکے بیٹھے تھے، اب خوب جی بھر کر کھاؤ اور باقی چیزیں دوسرے قیدیوں میں بانٹ آؤ۔ آخر یہ پراٹھے، شامی کباب، حلوہ پوری، شیر خورمہ اور مٹھائیاں ان کو بھی تو اچھی لگیں گی۔ میں یہ کہہ رہا تھا مگر میرا مشققی ساتھی کف افسوس مل رہا تھا: "کاش! وہ دال روٹی میں نے آپ کو دینے کے بجائے کوؤں کو کھلا دی ہوتی۔" میرے بہت کہنے پر اس نے ناشتا کیا اور باقی ساری چیزیں دوسرے قیدیوں میں بانٹ آیا اور ساتھ ہی ساتھ ان سے کہتا: "میرے میاں جی کے لیے یہ چیزیں آئی تھیں، انہوں نے سب تمھیں بھجوائی ہیں!"

ابا جان نے بتایا: "عید کے روز دوپہر ہوئی تو اسی طرح دروازہ کھٹکھٹایا گیا اور پھر اسی طرح ناشتے دان اور ہانڈیاں کپڑے میں بندھی ہوئی آ گئیں۔ ایسے ایسے کھانے آئے کہ مشققی ساتھی تو حیران رہ گیا۔ اس نے مجھے کھانا دیا اور باقی قیدیوں میں بانٹ آیا۔ رات کو پھر اتنا ہی کھانا آ گیا۔ غرض یہ کہ عید کے تین دن ہمارے رفقاء نے ملتان جیل میں اتنا زیادہ اور ایسی ایسی انواع و اقسام کا کھانا پہنچایا کہ سارے قیدی عش عش کر اٹھے۔"

ادھر ابا جان ہمیں یہ تفصیلات بتا رہے تھے، اُدھر اماں جان ہمیں متوجہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں: "دیکھو، سورۃ المریم میں یہی بات کہی گئی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا۔ (سورۃ المریم 19: آیۃ 96)

(ترجمہ) کہ جو اہل ایمان نیک اعمال کرتے ہیں، رحمٰن ان کے لیے لوگوں کے دلوں میں محبت ڈال دیتا ہے۔

وہ اسی طرح زندگی کے واقعات کو آیات اور احادیث کے ساتھ منطبق کر کے ہمیں ان کا مطلب سمجھایا کرتی تھیں۔ آج بھی اماں جان کے یہ الفاظ کانوں میں گونجتے ہیں: "تم عمل تو کر کے دیکھو، پھر آیتیں اور حدیثیں خود اُٹھ کر تم کو اپنا مطلب سمجھائیں گی۔"

اسی قید کے دوران میں جیل کے واقعات بیان کرتے ہوئے ابا جان نے بتایا: "ایک روز دوپہر کے وقت اچانک میرے کوارٹر کی دیوار کی دوسری جانب سے آواز آئی: "جنرل صاحب کا کھانا پکڑ لو۔" مشققی نے جا کر آواز دی: "کون ہے؟" تو دیوار کی دوسری طرف سے ایک چنگیر پر رومال میں لپٹی ہوئی روٹیوں کے اوپر سالن کا ڈونگا اور سلاد رکھی ہوئی پکڑائی گئی اور پھر فوراً ہی جنرل (ریٹائرڈ) محمد اکبر خان صاحب (راولپنڈی سازش کیس والے، جن کا کوارٹر ابا جان کے کوارٹر سے متصل تھا) دیوار پھاند کر میرے احاطے میں آ گئے اور کہا: "میں آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔"

"کھانے کے بعد کافی دیر تک جنرل اکبر خان صاحب نے باتیں کرتے ہوئے کہا: "مولانا صاحب، بس ایک آدھ دن کی دیر ہو گئی۔" میں نے ان سے پوچھا: "کس چیز میں دیر ہو گئی؟" جنرل اکبر صاحب کہنے لگے: "سری نگر فتح کرنے میں۔ ہم تو تقریباً وہاں پہنچ چکے تھے کہ ہماری جیتی ہوئی بازی مذاکرات کی میز پر ہار دی گئی اور ہمارا فتح کیا ہوا علاقہ جہاں ہم نے قدم قدم پر اپنا خون گرایا تھا، واپس کر دیا گیا۔ پھر مبینہ راولپنڈی سازش کیس کے بارے میں جنرل صاحب کہنے لگے: "یہ سازش تو خود ہمارے خلاف بلکہ پاکستان اور پاکستانی قوم کے خلاف کی گئی تھی۔ انگریز فوجی افسروں نے جاتے وقت ان سارے با صلاحیت لوگوں کی فہرستیں تیار کی تھیں جو لڑنے مرنے والے تھے اور جن میں کچھ کر گزرنے کا جذبہ تھا۔ انہوں نے وہ فہرستیں ہماری حکومت کے حوالے کر دی تھیں اور انہی میں سے اکثر افسروں کو پنڈی سازش کیس میں دھر لیا گیا، تا کہ جو شرابی، جوئے باز اور جونیئر افسروں کی بیویوں پر نظر رکھنے

والے افسر ہیں، وہی سنیارٹی پر ترقی پائیں اور ملک و قوم پر خوب ہاتھ صاف کریں۔ جنرل اکبر خان صاحب اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے اسی طرح دیوار پھاند کر اپنے احاطے میں چلے گئے۔"

"دوسرے دن پھر اسی طرح ان کے مشقتی نے آواز دی: "جنرل صاحب کا کھانا پکڑ لو۔ جیسے ہی کھانا پکڑا، جنرل صاحب دیوار پھاند کر آ گئے اور کہنے لگے: "جب کمیونسٹ روس کی طرف سے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کو دورے کا دعوت نامہ آیا تھا تو اس وقت امریکا سے بھی دعوت نامہ موصول ہوا۔ غور کرنے کا سوال یہ ہے کہ روس کا دعوت نامہ کیوں مسترد کیا گیا؟ پھر کہنے لگے: "امریکا کا سرمایہ دارانہ نظام روس کے اشتراکی نظام سے زیادہ خطرناک ہے۔ مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دور حکومت میں ہندو گائے، بندر، سانپ، پیپل کے درخت اور دریائے گنگا اور دریائے جمنا کو پوجتا رہا مگر لا الہ پڑھ کر نہیں دیا جب کہ اشتراکی لا الہ تو پہلے سے پڑھے ہوئے ہیں، بھلا اس میں کیا ہرج تھا کہ ہم روس جا کر انہیں الا اللہ پڑھا دیتے؟ کیونکہ آدھا کلمہ تو وہ پہلے ہی پڑھے ہوئے ہیں۔ جنرل صاحب سوال بھی خود ہی کرتے تھے اور جواب بھی خود ہی دیتے تھے۔

ابا جان نے بتایا: "اسی اثنا میں کسی نے جیل حکام کو مخبری کر دی کہ جنرل اکبر صاحب دیوار پھاند کر میرے پاس آتے ہیں اور ہم دونوں گھنٹوں باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس خوفناک انکشاف نے تو گویا جیل کے در و دیوار ہلا دیے اور بس پھر کیا تھا چند گھنٹوں کے اندر اندر وہاں پر موجود راولپنڈی سازش کیس کے سارے قیدیوں کو پولیس کی گاڑیوں میں بھر کر دوسری جیلوں کو روانہ کر دیا گیا۔ جیل والوں کو خطرہ ہوا ہو گا کہ کہیں یہ دونوں مل کر کوئی "جیل سازش" نہ تیار کر بیٹھیں۔"

گھر میں جب کبھی ابا جان کو تفہیم القرآن لکھنے کا موقع نہ ملتا تو کہا کرتے تھے: "دیکھو تم لوگ مجھے تفہیم القرآن لکھنے نہیں دے رہے ہو، اب میں جیل جانے ہی والا ہوں۔ جب بھی میں یہاں مصروفیت کی وجہ سے تفہیم القرآن نہیں لکھ پاتا تو اللہ تعالیٰ مجھے لے جا کر جیل میں بٹھا دیتے ہیں، جہاں زیادہ اطمینان سے لکھتا رہتا ہوں۔ ساتھ میں یہ بھی کہتے تھے کہ تفہیم القرآن مکمل کر لوں تو اسی اسلوب میں تفہیم الاحادیث بھی لکھنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

ہمارے تایا جان (سید ابو الخیر مودودی)، ابا جان پر زور دیتے تھے کہ وہ خود کو سیاست میں الجھانے کے بجائے علمی کام پر زیادہ توجہ دیں۔ ایک مرتبہ تایا جان نے ابا جان سے کہا تھا کہ وہ تفہیم القرآن کی پہلی دو جلدوں پر نظر ثانی کریں کیونکہ ان کو پڑھتے ہوئے تشنگی کا احساس ہوتا ہے لیکن ابا جان نے کہا: "اگر میں نے پہلی دو جلدوں پر نظر ثانی کی تو پھر تیسری پر بھی نظر ثانی کرنے کا مطالبہ آئے گا اور اس کے بعد یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا۔"

جب کبھی ابا جان جلسوں اور دیگر سیاسی و اجتماعی سرگرمیوں وغیرہ میں بہت زیادہ مصروف ہو جاتے تھے تو تایا جان انہیں سمجھاتے تھے: "یہ کام کرنے کے لیے اور دوسرے بہت لوگ موجود ہیں لیکن تحقیقی، علمی اور تصنیفی کام اور وہ بھی اس پائے کا کام جو آپ ہی کر سکتے ہیں، کرنے والے اور کتنے ہیں؟" وہ ابا جان کو نصیحت کرتے تھے: "آپ اپنا سارا وقت لکھنے میں گزارا کریں۔" ایک مرتبہ جماعت کے ایک صاحب سے تایا جان نے کہا تھا: "یہ جو تمہارے مولانا ہیں نا، یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ میں نے اسے اپنے ساتھ سلایا ہے، اس کی ضدیں پوری کی ہیں، اس کے ناز اٹھائے ہیں۔ میرا دل بہت دکھتا ہے جب تم اسے جلسوں اور جلوسوں میں کھینچے پھرتے ہو اور سیاست میں الجھاتے رہتے ہو۔ یوں اس کا وقت ضائع ہوتا ہے۔ یہ علمی، تحقیقی اور تصنیفی کام کرے تو کئی نسلیں اس سے استفادہ کریں گی۔"

اسی لیے اماں جان ہم بچوں پر بہت زور دیتی تھیں: "اپنے ابا جان کو تنگ نہ کیا کرو۔ جب کبھی بچے کسی چیز کے لیے تقاضا کرتے تو اماں جان ہمیں سمجھایا کرتی تھیں: "اگر میں ہر وقت تمھارے والد کی جان کھاتی رہتی کہ اب مجھے یہ اور یہ چاہیے اور میرے بچوں کو ایسی اور ویسی چیزیں درکار ہیں تو یہ ساری کتابیں جو انھوں نے لکھی ہیں، وہ نہ لکھ سکتے۔ تمھارے والد ایک ریسرچ اسکالر ہیں، ایک مصنف اور محقق ہیں۔ ان کو خاموشی، سکون اور اطمینان کی ضرورت ہے۔ تم ان سے کوئی مطالبہ نہ کیا کرو اور نہ ان کے سامنے اپنے تعلیمی مسائل بیان کیا کرو۔ ان کو اپنی باتوں میں بھی نہ الجھایا کرو۔ اس طرح اماں جان نے ابا جان کو ایسا سکون اور اطمینان مہیا کیا کہ وہ جو کچھ لکھتے تھے، ذہنی طور پر یکسو ہو کر اور جم کر لکھتے تھے۔

ابا جان تصنع، ظاہر داری اور ریا کاری سے سخت متنفر تھے۔ ایک مرتبہ کھانے کی میز پر، کھانا کھاتے ہوئے اماں جان نے ہم سب بہن بھائیوں کو مجموعی طور پر اور اُس روز محمد فاروق کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: "بیٹا! نماز پابندی سے پڑھا کرو، اگر نماز نہیں پڑھو گے تو لوگ کیا کہیں گے کہ مولانا مودودی کے بچے نماز نہیں پڑھتے۔" ابا جان کھانے کے دوران میں خاموش رہے اور جب اُٹھے تو بیسن پر ہاتھ دھونے کے بعد پان کی ڈبیا اٹھا کر چلتے چلتے کہا: "لیکن بیٹا! جب بھی نماز پڑھنا، خدا کی نماز پڑھنا اپنے باپ کی پڑھنے کے لیے کھڑے نہ ہونا اور خاموشی سے اپنے دفتر کی طرف چل دیے۔" اس طرح ابا جان بڑی بڑی بات ایک جملے میں کہہ دیا کرتے تھے، بحث کرنا ان کی سرشت ہی میں نہ تھا۔ ابا جان نے جتنا لکھا ہے، اگر ان کی تحریروں کو جمع کیا جائے اور صفحات کا حساب لگا کر ان کی زندگی کے ایام سے آپ تقسیم کریں تو دیکھیں کہ فی یوم کتنے صفحے آتے ہیں۔ اب اس کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی جن طوفانی ادوار سے گزرتی رہی، اس کو اگر دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنا کام وہ کیسے کر گئے؟ یہ کام مکمل ذہنی یکسوئی اور سکون کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا اور یہ سکون ان کو اماں جان نے مہیا کیا تھا۔

ابا جان نے سورہ یوسف کی جو تفسیر بھی ہے، اسے پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس وقت وہیں کہیں موجود تھے اور آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہیں۔ سورہ الکھف یا سورۃ الفیل کی تفسیر پڑھتے ہوئے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ ذہنی طور پر اسی زمان و مکاں (time and space) میں منتقل ہو گئے تھے۔

برسوں بعد طالبات کے کالج جدہ میں، شعبہ عربی کی شامی النسل سربراہ مجھ سے کہنے لگیں کہ ایک فقرے میں اپنے والد کی صفت بیان کرو تو میرے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا: انه كان يعيش في عالم الثاني (ترجمہ) "کہ وہ ایک اور ہی دُنیا میں رہتے تھے۔" اس جواب سے وہ بہت خوش ہوئیں اور کہنے لگیں: "امام ابن تیمیہ کی بھی یہی صفت تھی۔"

ابا جان کی خواہش ہوا کرتی تھی کہ جب وہ کھانے کی میز پر آئیں تو ہم کبھی وہاں موجود ہوں۔ بچوں سے ملنے کا یہ واحد وقت تھا، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ سب بچے ان کے ساتھ کھانا کھائیں۔ اپنے معمولات میں وہ اس قدر پابندی وقت کا اہتمام کرتے تھے کہ چاہیں تو آپ گھڑی ملا لیں۔ اسی لیے ہم ان کے آنے سے پہلے کھانے کی میز پر آ جاتے تھے لیکن اکثر ایسے محسوس ہوتا تھا کہ اگرچہ وہ کھانا کھا رہے ہیں لیکن زمناً کھانے کے دوران میں بھی کچھ سوچ بچار میں مصروف ہیں۔

ابا جان ہمیں اکثر کہا کرتے تھے: "انسان خیر اور شر کا مرکب ہوتا ہے۔ آدمی کا کمال یہ ہونا چاہیے کہ وہ دوسرے کی خیر سے فائدہ اٹھائے اور اس کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے۔ سخت نادان ہوتا ہے وہ شخص جو دوسرے کے شر سے تو نقصان اٹھائے اور ان کی خیر سے محروم رہ جائے۔"

سخت کلامی یا طعنہ زنی تو ان کی سرشت ہی میں نہ تھی۔ اگر کبھی کسی کو سخت جملہ کہتے بھی تھے تو اسی وقت جب انہیں بہت زیادہ کوفت پہنچی ہو اور وہ جملہ بھی یہ ہوتا: "ان لوگوں کے نزدیک میری شرافت میرا سب سے بڑا جرم ہے۔" پھر بھی حتی الامکان ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ دوسروں کی

خیر کو اپیل کریں اور اسے ابھار کر بروئے کار لائیں اور ان کے شر کو دفع کریں۔ یہ پون صدی کی جاں گسل کش مکش ہے، جس میں وہ بڑی حکمت اور تدبر سے ملت اسلامیہ کی اصلاح کے کام میں لگے رہے۔

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ ابا جان کی شادی اگر خواہ مخواہ مطالبے کرنے والی جھگڑالو قسم کی عورت سے ہوئی ہوتی تو کیا بنتا۔ اماں جان کو تو شاید اللہ تعالی نے بنایا ہی ابا جان کے لیے تھا۔ ان کا اعلیٰ ادبی ذوق، بلند پایہ علمی رجحان، اپنی ذات کی نفی، خود داری اور ابا جان کی دلداری کی تو کوئی حد ہی نہیں تھی۔ عربی زبان کا ایک محاورہ ہے: "البنات عود" کہ خواتین خوشبو ہوتی ہیں، جو خود تو پردے میں رہتی ہیں مگر ان کا سلیقہ اور تھوڑے سے پیسوں میں بنائی ہوئی بہت ساری عزت اور بچوں کی تعلیم و تربیت سب کو نظر آتی ہے۔

ابا جان ہمیں کہا کرتے تھے: "اگر مجھے تمھاری تربیت کی پوری طرح مہلت ملتی تو تمھیں مثالی اولاد بناتا۔ چونکہ میں تم پر بھر پور توجہ نہیں دے سکا، اس لیے تم سے باز پرس کا حق بھی نہیں رکھتا۔ میں نے اپنا وقت دین کے کاموں اور دین کی سربلندی کے لیے وقف کر دیا ہے، اس لیے تمھاری تربیت اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔" ہم گواہی دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کا ہر لمحہ اللہ کے دین کے لیے جدو جہد کرتے رہے۔

انتقال سے چند ماہ پیشتر ایک صاحب نے دورانِ ملاقات بے رحمانہ تنقید کرتے ہوئے ابا جان سے کہا: "ایران میں آیت اللہ خمینی صاحب تو انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہو گئے مگر آپ اتنے برس کی جد و جہد کے باوجود پاکستان میں کیوں انقلاب نہیں لا سکے؟" ابا جان نے جواب دیا: "میں تو اللہ تعالیٰ کے کام کے لیے دہاڑی کا مزدور ہوں۔ مجھے اپنے حصے کی دہاڑی کرنی ہے اور اپنے مالک سے اجرت لینی ہے۔ اب یہ کہ عمارت کب مکمل ہو گی؟ کیسی ہو گی؟ مکمل ہو بھی سکے گی یا نہیں؟ اس سے مزدور کو کیا غرض؟ اسے تو ایمان داری سے اپنی دہاڑی سے غرض ہے۔ مراد یہ کہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ابا جان نے اللہ کی راہ میں اپنے حصے کی دہاڑی کرنے میں گزارا، زبان اور قلم سے فکر اور عمل سے، غرض ہر طرح سے اپنا فرض انجام دیا۔ وہ نہ زندہ باد کے تمنائی تھے اور نہ مردہ باد کے نعروں سے کبھی خائف ہوئے۔ عام انسانوں سے موازنہ کر کے دیکھیں تو یوں لگتا ہے کہ ان کی ذات، ان کا جسم، ان کی ضروریات، ان کی اولاد اور اس کا مستقبل، ان کے نزدیک شاید کوئی وجود ہی نہیں رکھتا تھا۔ ہم نے ابا جان کو ان کی پوری زندگی میں جتنا بے نیاز دیکھا ہے، ایسی بے نیازی کسی اور فرد میں نہیں دیکھی۔

دادی اماں ہم بچوں سے کہا کرتی تھیں: "اصل نسل سید میں کچھ بنیادی صفات ہوتی ہیں۔ جب کوئی تم سے کہے کہ میں سید ہوں تو اسے سات چیزوں میں پرکھو:

(1) سید کو طیش نہیں آتا اور آتا ہے تو صرف دین کے معاملے میں آتا ہے۔

(2) سید کبھی ذاتی انتقام نہیں لیتا۔

(3) سید کبھی گالی کے جواب میں گالی نہیں دیتا۔

(4) سید کسی کے لیے دل میں کینہ نہیں رکھتا اور کسی کی غیبت نہیں کرتا۔

(5) سید کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

(6) سید کھانے میں عیب نہیں نکالتا۔ بھوک اور پیاس سے کبھی بے حال نہیں ہوتا۔ جو سامنے آئے صبر سے کھا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔

(7) سید پر زندگی میں کبھی نہ کبھی سخت وقت آتا ہے اور اس کی جان تک خطرے میں ہوتی ہے لیکن وہ ہمت نہیں ہارتا، اللہ کے بھروسے پر ہر خطرے سے لڑ جاتا ہے اور بدترین حالات سے ٹکر لے لیتا ہے۔

دادی اماں کی یہ بیان کردہ خصوصیات در حقیقت بچوں کی تربیت اور ذہنی تشکیل کے اصول تھے، تا کہ وہ اپنی نسبت کے حوالے سے ان امور کا خیال رکھیں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ابا جان میں یہ ساتوں خصوصیات بھر پور انداز میں موجود تھیں۔ جن حالات میں عام آدمی غصے میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے، ان حالات میں بھی وہ تحمل اور کمال بردباری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ کسی کے خلاف دل میں کینہ نہیں رکھتے تھے:

کفر است در طریقتِ ما کینہ داشتن

آئین ماست سینہ چون آئینہ داشتن

(ترجمہ) ہمارے طریقِ زندگی میں کسی کے خلاف دل میں کینہ رکھنا کفر ہے۔ ہمارا طریقہ یہ ہے کہ دل کو شیشے کی طرح صاف رکھا جائے۔

وہ لوگ بھی، جو ابا جان کو سنگین سزائیں دینے اور بلا وجہ جیلوں میں رکھنے کے ذمے دار تھے ، وہ حضرات گرامی جب کبھی بعد میں ملنے آتے تو ابا جان ان سے بھی اس خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے ملتے ۔ کبھی انہوں نے باتوں باتوں میں بھی یہ جتانے کی کوشش نہیں کی کہ آپ لوگوں نے میرے ساتھ کیا سلوک روا رکھا تھا۔

ایک روز، ایک صاحب ابا جان سے سفارشی خط لینے آئے۔ وہ اب ریٹائر ہو چکے تھے اور ہاتھ تنگ تھا۔ مالی دشواریوں کی وجہ سے دوبئ یا ابو ظہبی جانا چاہتے تھے۔ حسب معمول، ابا جان نے سفارشی خط دے دیا جو ان کے کام آیا اور اچھی ملازمت بھی مل گئی۔ یہ صاحب کون تھے؟ یہ وہی صاحب تھے جنہوں نے فوجی ملازمت کے دوران میں مارشل لا عدالت کے جج کی حیثیت سے ابا جان کو پھانسی کی سزا سنائی تھی اور ان کے دستخط آج تک فیصلے پر ثبت ہیں۔ پھانسی کی سزا سنانے والے کے لیے سفارشی خط اور یہ اعلیٰ ظرفی ابا جان کا خاصہ تھی۔

جنرل محمد اعظم خاں، جن کے زمانے میں ابا جان کا کورٹ مارشل ہوا تھا، بعد میں اکثر ملنے آیا کرتے تھے۔ ابا جان تو حضرت مسیح علیہ السلام کے اس قول پر عمل کرتے تھے: "اے مچھلیوں کو پکڑنے والو! آؤ، میں تمہیں انسانوں کا شکار کرنا سکھا دوں۔ مراد یہ ہے کہ اپنے قول سے، اپنے عمل سے اور اپنے فعل سے انسانوں کو شکار کرو اور انہیں اللہ کی بندگی کے جال میں لا ڈالو (اپنے جال میں نہیں)۔"

اپنے حسن اخلاق سے انہوں نے اپنے دشمنوں کے دلوں میں بھی گھر کر لیا۔ ہم گواہ ہیں کہ ابا جان نے اپنی ذات پر پھبتیاں کسنے والے جناب ذوالفقار علی بھٹو کے لیے بھی ہمیشہ کلمہ خیر ہی کہا۔ ان کا نام بھی انہوں نے ہمیشہ احترام کے ساتھ لیا اور ہمیشہ یہی کہا کہ: "اللہ تعالیٰ انہیں راہِ راست پر لائے اور حالات کو بہتر بنائے، تا کہ اس ملک کا اور اس قوم کا مزید نقصان نہ ہو۔" ابا جان نے گالی کے جواب میں، گالی تو دور کی بات ہے، پلٹ کر کبھی کوئی سخت لفظ بھی نہیں کہا۔ مجھے یہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ ہمارے بچپن میں ابا جان، اچھرہ کی ایک مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد گھر واپس آئے۔ امام مسجد، ابا جان کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے اپنے سامنے بیٹھے، ہمارے ابا جان کے خلاف سارا خطبہ جمعہ دے ڈالا اور آخر میں تان اس انوکھی منطق پر توڑی کہ اگر کوئی مودودی مر جائے اور اس کی قبر پر بیری کا درخت اگ آئے تو اس بیری کے پتے کھا کر اگر کوئی بکری دودھ دے، تو سنو وہ دودھ پینا بھی حرام ہے۔ ابا جان کے ساتھ جو بھائی نماز جمعہ پڑھنے گئے تھے، واپس آ کر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے اور ہمیں خطبے کا

یہ حصہ سنا رہے تھے لیکن ابا جان انتہائی سنجیدگی اور متانت سے بیٹھے تھے بلکہ حیران ہو ہو کر ہم ہنسنے والوں کی طرف دیکھ رہے تھے کہ بھلا یہ بھی کوئی ہنسنے والی بات ہے۔

اسی طرح ایک روز جامعہ اشرفیہ، لاہور کے ایک بہت بڑے عالم دین نے ابا جان سے کہا: "مولانا احمد علی لاہوری صاحب نے آپ پر تنقید کی ہے مگر آپ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس خاموشی سے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔"

ابا جان نے جواب میں کہا: "مجھ پر جو آدمی بھی بلا وجہ تنقید کرتا ہے، بلاشبہ اس سے مجھے دکھ ہوتا ہے لیکن اس حوالے سے مولانا احمد علی صاحب کا معاملہ بالکل جدا ہے۔ ان کی نیکیاں اتنی زیادہ ہیں کہ وہ تنقید کرتے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ ان کی نیکیوں کے صدقے ان کی یہ بے جواز تنقید، اللہ تعالیٰ بخش دے گا اور میری کوتاہیاں اتنی ہیں کہ جواب میں میری خاموشی کی وجہ سے ان میں ان شاء اللہ کچھ کمی واقع ہو جائے گی۔"

یہاں پر میں ابا جان کا یہ فرمان پیش کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ: "یہ کام اگر ہم دوکان داری کے طور پر کر رہے ہیں تو ہم پر اور ہمارے کاروبار پر ہزار لعنت، اور اگر یہ اخلاص کی بنا پر خدا کے دین کی خدمت ہے تو ہم میں سے ہر ایک کو خوش ہونا چاہیے کہ یہ کام تنہا وہی نہیں کر رہا ہے، دوسرے بھی اس میں سرگرم کار ہیں۔ اس کے لیے خواہ کوئی ہمیں رقیب سمجھ کر دور پھینکنے کی کوشش کرے، ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اسے رقیب نہ سمجھیں اور بار بار اس کے قریب جائیں، یہاں تک کہ اللہ اس کا دل بھی بدل دے۔"

ابا جان کو بھوک، پیاس اور نیند پر بہت زیادہ کنٹرول تھا۔ وہ کھانے میں کبھی کوئی عیب نہیں نکالتے تھے۔ اگر پکانے والی خاتون کبھی غلطی سے نمک زیادہ ڈال دیتی یا بالکل ہی ڈالنا بھول جاتی تو وہ عیب نکالے بغیر صبر، شکر سے کھا لیتے تھے اور اگر کسی بچے کے منہ سے حرف شکایت نکلتا تو وہ کہتے تھے: "روزانہ تو ٹھیک پکتا ہے اگر کسی ایک دن کوئی کمی رہ بھی گئی ہے تو بھلا اس میں الجھنے اور ناراض ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" اس لیے ہم سب بہن بھائی بھی کھانے میں اکثر عیب نہیں نکالتے تھے۔ اگر کسی کے منہ سے بے دھیانی میں ایسی ویسی بات نکل جاتی تھی تو فوراً دادی اماں کہتی تھیں: "یہ نقلی سید ہے بلکہ نو مسلم ہے بے چارہ، کیا کرے اپنی عادت سے مجبور ہے۔" اسی لیے خفت کے مارے کوئی کچھ نہیں کہتا تھا۔ دادی اماں کے انتقال کے بعد بھی ہم بہن بھائیوں میں یہ کہنے کی روایت برقرار رہی اور کھانے میں عیب نکالنے والا "نقلی سید" اور "نو مسلم" کہلاتا رہا۔

سنہ 1957ء میں 6 اور 7 دسمبر کی درمیانی رات کو دو بجے مختصر علالت کے بعد دادی اماں انتقال کر گئیں۔ تمام عمر من مریضم تو طبیبم کہہ کر تندرست ہو جانے والی دادی اماں بالآخر اپنے طبیب حقیقی سے جا ملیں۔ یعنی ہمیشہ کے لیے شفا یاب ہو گئیں۔

دادی اماں کے انتقال کے بعد عام لوگوں کا خیال تھا کہ اماں جی کے صاحبزادے اتنے مشہور عالم دین ہیں، ضرور اپنی والدہ صاحبہ کے ایصال ثواب کے لیے قل، دسواں، بیسواں اور چالیسواں کریں گے اور خوب بریانی، زردے کی دیگیں پکیں گی، حلوے اور نان بانٹے جائیں گے لیکن دیکھنے والے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ابا جان نے نہ دادی اماں کے قل کیے اور نہ دوسری ہی بدعات۔ اس پر جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ کہنے والوں نے تو یہاں تک کہا کہ یا اللہ تو سب کو نیک اولاد دے! ایسی اولاد تو کسی دشمن کو بھی نہ دے، جس نے اماں جی کو قبر میں اوندھا ڈال دیا اور پھر پلٹ کر بھی نہ پوچھا۔ ان باتوں کا ہمارے گھر میں سب نے بہت برا مانا لیکن ابا جان ان تبصروں سے بہت محظوظ ہوئے۔

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھیے! یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ایک غریب آدمی جو دمے کا پرانا مریض تھا اور مرض کی شدت کی وجہ سے اپنی روزی خود کمانے سے قاصر تھا، روزانہ دوپہر کو ہمارے گھر آتا تھا اور اس کو بڑی عزت سے کھانا کھلایا جاتا تھا۔ کھانے کے بعد وہ ہمارے گھر کے بیرونی لان میں چار پائی پر

لیٹ جاتا تھا اور رات کو کھانا کھا کر اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ ابا جان کا حکم تھا کہ دوپہر کو اسے کھانا، دادا ابا کے ایصالِ ثواب کے لیے کھلایا جائے اور رات کو دادی اماں کے ایصالِ ثواب کا کھانا پیش کیا جائے۔ پھر اسی سال رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں سعودی عرب جانا ہوا تو ابا جان نے دادی اماں کے ایصالِ ثواب کے لیے حج کیا اور کئی عمرے بھی کیے۔

6 جنوری 1964ء کو ابا جان تیسری بار جیل گئے۔ چند ہفتوں بعد کتابوں سے بھرے بڑے بڑے صندوق جیل جانے شروع ہو گئے۔ جیل والے بھی حیران ہوتے تھے کہ اے کلاس کے دوسرے قیدیوں کے لیے انواع و اقسام کے کھانے آتے ہیں مگر مولانا صاحب کے لیے صرف کتابیں آتی ہیں۔ اس وقت ابا جان لاہور جیل میں تھے، جہاں اب شادمان کالونی ہے۔ ہم ہر ہفتے ملاقات کے لیے جاتے تھے۔ اس پورے عرصے اماں جان خاصی بیمار رہیں۔ اب دادی اماں بھی دنیا میں نہیں رہی تھیں۔ ان کی موجودگی اماں جان کے لیے بہت بڑا اخلاقی سہارا ہوتی تھی۔

7ـــ دیکھیے: پروفیسر خورشید احمد تذکرہ زندان، ناشر منشورات، لاہور۔

گرفتاری سے کچھ عرصہ پہلے، خود ساختہ فیلڈ مارشل صدر محمد ایوب خان سے ابا جان کی بڑی یاد گار گفتگو ہوئی۔ یہ ملاقات لاہور میں ہوئی تھی اور گورنر مغربی پاکستان امیر محمد خان آف کالا باغ بھی اس موقعے پر موجود تھے۔ ایوب خان صاحب کا ارشاد یہ تھا: "مولانا آپ سیاست چھوڑ دیں، اس ملک کو اور حکومت کو آپ کی بڑی ضرورت ہے۔"

ابا جان نے کہا: "ایوب خان صاحب، آپ نے ساری زندگی فوج کی ملازمت میں گزاری ہے، بھلا آپ کس طرح مجھے زندگی کے اجتماعی معاملات میں دلچسپی لینے سے روک سکتے ہیں؟ اور کس اصول کے تحت سیاست سے دست کش ہونے کا مشورہ دے رہے ہیں؟"

صدر جنرل ایوب خاں صاحب نے فرمایا: "مولانا، سیاست ایک گندا کھیل ہے، آپ جیسے عالم شخص کو اس میں نہیں آنا چاہیے۔"

ابا جان نے جواب دیا: " تو آپ کا کیا خیال ہے کہ اسے گندا کھیل ہی رہنا چاہیے؟ اس میں گندے لوگوں کے بجائے ستھرے کردار کے لوگ آئیں گے تبھی تو یہ گندگی صاف ہو گی۔"

اس کے بعد ایوب صاحب نے کہا: "آپ اپنے بچوں کے نام سے فیکٹریاں لگائیے، ہم آپ کو بنکوں سے قرضے، پرمٹ اور لائسنس دیں گے، جس عرب ملک میں آپ چاہیں ہم آپ کو سفیر بنا کر بھیج دیں گے۔ پھر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کا وائس چانسلر بننے کی پیش کش بھی کر دی مگر ان تمام پیش کشوں کے جواب میں، ادھر ایک شانِ استغنا تھی اور بس!

ابا جان نے صرف یہ کہا: "آپ نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے۔"

ایوب صاحب حیران تھے کہ یہ کیسا انسان ہے جو سونے، روپے اور مٹی کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔ ابا جان ایک شعر اکثر پڑھا کرتے تھے، جو خود ان کے حسبِ حال تھا:

ہزار دینے کا ایک دینا ہے

اک دل بے مدعا دیا تو نے

ابا جان نے ایک جگہ لکھا ہے: ”ایمان بالغیب قلب کی اس کیفیت کا نام ہے، جس کی بنا پر انسان غائبات کی خاطر مشاہدات اور موجودات کا انکار کر دیتا ہے۔ آخرت کی کامیابی کے لیے دنیاوی فائدوں کو ٹھکرا دیتا ہے، دنیاوی نقطۂ نظر سے سو فی صد خسارے کا سودا کر لیتا ہے اور اس پر مطمئن رہتا ہے۔ ایمان بالغیب کی بنا پر انسان دنیا اور دنیا کے فائدے اور نقصان سے دُور بہت دُور جنت کی طرف دیکھتا ہے اور معاملات کرتا ہے۔ اس کی نگاہ جنت کے نظاروں پر جمی ہوتی ہے۔ جنت کی نہروں، جنت کے پھل، اس کی چھاؤں اور اس کی راحتوں پر جمی ہوتی ہے۔“

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ابا جان 1964ء میں تیسری بار جیل میں تھے، تب میرے بھائی احمد فاروق نے ایم بی بی ایس کا امتحان بہت اچھے نمبروں میں پاس کیا تھا۔ ان کے ایک ہفتے بعد میں بھی ایم اے کے امتحان میں پاس ہو گئی۔ ہم دونوں خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ ہم نے خوش خیالی کی اسی لہر میں اماں جان سے انعام کا مطالبہ کیا تو انہوں نے شفقت سے پاس بلایا اور خاموشی کے ساتھ مسکرا کر ٹال دیا۔ جب دو تین دن گزر جانے کے باوجود گھر میں کوئی ایسی ہلچل نہ مچی، جس سے اندازہ ہوتا کہ دو بچوں کے پاس ہونے سے اس گھر کے بڑوں کو کوئی قابل ذکر خوشی ہوئی ہے تو بالآخر ہمارے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔ ہم نے کہا: ”آپ تو ہماری قدر ہی نہیں کر رہیں۔ اس پر اماں جان نے یہ شعر سنایا:

آدمیت چیز ہے کچھ، علم ہے کچھ اور شے

لاکھ طوطے کو پڑھایا، پر وہ حیواں ہی رہا

یہ شعر سننا تھا کہ ہمارے چھوٹے بہن بھائی ہنس ہنس کر لوٹن کبوتر بن گئے اور ہم دونوں شرمندہ ہو کر سارا دن منہ چھپاتے پھرے۔ بعد میں اماں جان نے ہم دونوں کو اپنے پاس بٹھایا، شفقت سے تھپتھپایا اور ماتھا چومتے ہوئے سمجھایا: ”یہ ایک عالم دین کا گھر ہے۔ میرے بچو، یہاں اصل قدر و قیمت علم اور کردار کی ہے۔ یہ معمولی ڈگریاں یہاں پر ویسی قدر و قیمت نہیں رکھتیں کہ جس طرح عام طور پر انہیں دیکھا جاتا ہے۔ اصل علم تو دین کا علم ہے، قرآن اور حدیث کا علم ہے۔ دینی علم کی عدم موجودگی میں تم چاہے کتنی ہی دُنیاوی ڈگریاں حاصل کر لو یہ صفر کو صفر سے ضرب دینے کے مترادف ہو گا۔“ اماں جان کے مضبوط لہجے میں بیان کردہ حقیقت کو سن کر ہمارے دل مطمئن ہو گئے۔

1964ء میں گرفتاری کے بعد ابا جان پر ملک کو نقصان پہنچانے کا مقدمہ چلایا گیا۔ اس وقت کے ہوم سیکرٹری صاحب نے ابا جان کی موجودگی میں ہائی کورٹ کے سامنے حلفاً جھوٹی گواہی دی۔ غالباً اس کے صلے میں ایوب خاں نے تھل کے علاقے میں ان کو خاصی معقول اراضی بطور انعام دی۔ ان صاحب نے اپنے دونوں بیٹوں کو اراضی کا قبضہ لینے کے لیے بھیجا۔ اراضی کے قدیم مالکان سخت طیش کے عالم میں تھے۔ انہوں نے مذکورہ سیکریٹری صاحب کے بیٹوں کو کلہاڑیاں مار کر ہلاک کر دیا، لاشیں سارا دن سخت گرمی میں دھوپ میں پڑی رہیں۔ قاتل کسی کو لاشیں اٹھانے نہیں دے رہے تھے۔ آخر بڑے صاحب پولیس کی بڑی بھاری جمعیت لے کر خود گئے اور لاشیں اٹھا کر لائے۔ ان کے صرف دو ہی بیٹے تھے۔ ایک کی عمر 32 سال تھی اور دوسرے کی 28 برس۔ ہمارے ایک مشترکہ ملنے والے ان کے ہاں تعزیت کو گئے تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا: ”بڑے صاحب اور ان کے گھر والے (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ ہم تو کانوں میں انگلیاں ڈال کر، چُپ چاپ وہاں سے بھاگ آئے، ورنہ ہم بھی گناہ گار ہوتے۔

ابا جان نے ایک جگہ لکھا ہے: ”افلاس، جہالت اور انگریز کی ڈیڑھ سو سالہ غلامی نے ہمارے بیش تر افراد کو بے غیرت اور بندہ نفس بنا دیا ہے، وہ روٹی اور عزت کے بھوکے ہیں۔ ان کا یہ حال ہو گیا ہے کہ جہاں کسی نے روٹی کے چند ٹکڑے اور نام نمود کے چند کھلونے پھینکے یہ اس کی طرف لپکے۔ اپنے دین اور ایمان، اپنے ضمیر، اپنی غیرت و شرافت اپنی قوم و ملت کے خلاف کوئی بھی خدمت بجا لانے میں ان کو باک نہیں ہوتا۔ گذشتہ ڈیڑھ سو برس کا تجربہ

بتاتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں ہی کی جماعت سے ایک دو نہیں سیکڑوں ہزاروں خائن اور غدار انگریزوں کو مل گئے، جنہوں نے تقریر سے، تحریر سے، ہاتھ اور پاؤں سے حتیٰ کہ تلوار اور بندوق تک سے اپنے مذہب اور اپنی قوم کے مقابلے میں دشمنوں کی خدمت کی۔"

جب ابا جان، جیل سے رہا ہو کر گھر آئے تو ہمارے ایک عزیز جو اسٹیٹ بنک آف پاکستان میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ لیے مبارک باد دینے تشریف لائے۔ اپنی عادت کے مطابق وہ چہک نہیں رہے تھے، بلکہ چُپ چُپ سے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد ہم لوگوں نے حیرانی سے کہا کہ آج یہ اتنے بجھے بجھے سے کیوں تھے؟

ابا جان نے اس کی وجہ بتائی: "جماعت پر پابندی کے دوران، مقدمے کے سلسلے میں پولیس کی گاڑی میں مجھے جیل سے لاہور ہائی کورٹ لایا جا رہا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی ہائی کورٹ کے گیٹ کی طرف مڑ رہی تھی۔ سامنے سے یہ صاحب اپنی گاڑی خود چلاتے ہوئے آ رہے تھے۔ جونہی میری آنکھیں ان کے ساتھ چار ہوئیں، تو غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ سلام کے لیے اٹھ گیا اور میں نے اشارے سے انہیں سلام کیا۔ اس بندہ خدا نے میری طرف دیکھا ضرور مگر جواب دیے بغیر آگے بڑھ گئے۔ غالباً سلام کا جواب اس لیے نہ دیا کہ کہیں سپرنٹنڈنٹ پولیس نہ دیکھ لے۔"

پھر ابا جان نے ہمیں سمجھایا: "یہ بات میں نے آپ لوگوں کو اس لیے بتائی ہے کہ اس دنیا اور اس کی ڈھلتی پھرتی چھاؤں کی حقیقت کو سمجھیں۔ یاد رکھیے کہ ساری دوستیاں، رشتے داریاں اور محبتیں اسی وقت تک ہوتی ہیں جب آدمی کے حالات اچھے ہوں، جیسے ہی حالات بدلتے ہیں، ساری چاہتیں، دوستیاں اور رشتے داریاں دم توڑ دیتی ہیں۔"

ہم کو یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ جب ابا جان جیل سے باہر ہوتے تھے تو ہم مولانا کے صاحبزادے اور صاحبزادیاں ہوتے تھے اور جیسے ہی وہ جیل جاتے تھے تو یوں محسوس ہوتا کہ اس بھری دنیا میں ہم تنہا ہیں۔ جونہی ابا جان جیل سے رہا ہو کر آتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ ہم پر جان چھڑکنے والے بہت زیادہ ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم خود آگے بڑھ کر کسی سے نہیں ملتے بلکہ اس انتظار میں رہتے کہ وہ ہم سے پہلے ملے اور اسی لیے کچھ لوگ ہمیں کم آمیز سمجھتے تھے۔ وجہ یہ ہے کہ ابا جان کی وجہ سے لوگ دوسروں کے سامنے ہم سے آنکھ ملانا پسند نہیں کرتے تھے کہ خواہ مخواہ سروس ریکارڈ خراب ہو جائے گا، ترقی رک جائے گی اور پتا نہیں کہاں کہاں انکوائریاں ہوں گی۔ یہ خود کو سنبھال کر رکھنے اور ملنے میں پہل نہ کرنے کی عادت بچپن ہی سے راسخ ہو گئی تھی۔

ابا جان کی عادت تھی کہ اگر کوئی استدلال سے ان کو قائل کرتا تھا تو وہ فوراً اپنی رائے سے رجوع کر لیتے تھے اور درست دلیل کے مقابلے میں کبھی اپنے موقف پر اصرار نہیں کرتے تھے۔ مجھے یہ تجربہ اس وقت ہوا جب اسلامیہ کالج برائے خواتین، کُوپر روڈ لاہور کی پرنسپل پروفیسر زینب کاکا خیل صاحبہ نے فون کیا کہ: "کالج میں ایک استاد کی اسامی عارضی بنیاد پر خالی ہوئی ہے اگر چاہو تو کل آ کر انٹرویو دے دو۔" میں نے جواب میں کہا: "میں تو حاضر ہوں، بس آپ ابا جان کو قائل کر کے ان سے اجازت لے دیجیے۔" وہ ایک گھنٹے کے اندر ہمارے گھر آ گئیں اور ابا جان سے ان کے دفتر میں جا کر بات چیت کی۔

پرنسپل صاحبہ نے ابا جان سے کہا: "ہمارے ہاں کالج میں ایسے گھرانوں کی لڑکیاں اچھے نمبر لے کر آ رہی ہیں، جن کا تعلق نا شائستہ لوگوں سے ہے۔ ان کے اخلاق بھی ویسے ہی غیر معیاری اور بعض حوالوں سے لچر ہوتے ہیں، ان کے لباس کی تراش خراش اور بول چال کے انداز دیکھ کر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ وہ کچے ذہن کی معصوم بچیوں کو پڑھا اور ان پر اپنا رنگ چڑھا رہی ہیں لیکن نہ چاہنے کے باوجود ہم انہیں رکھنے پر مجبور ہیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ آپ جیسے لوگ اپنی بچیوں کو پڑھا لکھا کر گھر میں بٹھا لیتے ہیں اور یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہماری بچیوں کو نوکری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ٹھیک ہے آپ کو نوکری کی ضرورت نہیں لیکن قوم کی بچیوں کو تو ان جیسی دین دار اور شائستہ اساتذہ کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا کرنا مناسب نہیں ہے تو پھر یہ سارے سکول کالج بند کیجیے، ان کو تالا لگائیے تا کہ اخلاق باختہ گھرانوں کی لیکچرار خواتین سے قوم کو نجات ملے۔ ور نہ پھر مناسب یہی ہے کہ اپنی بیٹی کو کل انٹرویو کے لیے بھیج دیجیے، ہمیں اپنی بچیوں کے لیے اس جیسی ٹیچر کی ضرورت ہے۔ انہوں نے دو تین مثالیں بھی دیں کہ کس طرح معصوم بچیوں کو گمراہ کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر زینب کاکا خیل صاحبہ نے اتنی درد مندی سے یہ بات کہی تھی کہ ابا جان نے فوراً ان سے کہہ دیا: ”بے شک آپ ابھی میری بیٹی کو اپنے کالج لے جائیے۔ پروفیسر کاکا خیل، اماں جان اور مجھے مبارک باد دیتے ہوئے، دوسرے روز انٹرویو کے لیے پہنچنے کی تاکید کر کے چلی گئیں۔ اگلے روز میں نے انٹرویو دیا اور گھر آ گئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پرنسپل صاحبہ نے انٹرویو لینے والی اساتذہ سے میرے لیے سفارش کا ایک لفظ تک نہ کہا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مسز کاکا خیل نے انگریزی کی ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ سے پوچھا: ”آپ نے کس کا انتخاب کیا ہے؟“ اتفاق سے انہوں نے میرا نام لیا: ”حمیرا خاتون۔“ اس پر پرنسپل صاحبہ نے پوچھا: ”آپ کو معلوم ہے یہ کس کی بیٹی ہے؟“ انہوں نے کہا: ”میں نے غور سے اس کے والد کا نام نہیں پڑھا۔ خیر، ہمیں اس سے کیا کہ یہ کس کی بیٹی ہے، ہمیں تو کام سے غرض ہے۔“

پروفیسر زینب کاکا خیل صاحبہ نے کہا: ”یہ تو مولانا مودودی صاحب کی بیٹی ہے۔“ تب انہوں نے غور سے فارم پر ابا جان کا نام پڑھا اور بے اختیار کہا: ”اگر یہ مولانا صاحب کی بیٹی ہے اور مولانا اپنی بیٹیوں کی ایسی پرورش اور تعلیم و تربیت کرتے ہیں تو پھر مولانا مودودی سے ہمارا اختلاف ہی ختم ہو گیا ہے۔“ یاد رہے کہ یہ خاتون، ابا جان کی شدید مخالف تھیں اور خواتین کی آزادی کی زبردست علم بردار تھیں۔

جب میں نے کالج میں پڑھانا شروع کر دیا تو ہماری صدرِ شعبہ مجھ سے بہت شفقت اور مہربانی سے پیش آتی رہیں بلکہ سارے اسٹاف ممبر بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ اکثر نے تو مجھ سے کہا: ”تم اپنے والد کا چلتا پھرتا اشتہار ہو۔ تم کو دیکھ کر اور تم سے مل کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مولانا صاحب خواتین کی تعلیم یا سروس کے مخالف ہیں۔ سچ ہے کہ جب تک انسان کسی سے خود نہ ملے، محض سنی سنائی باتیں مان کر اس کے بارے میں رائے قائم نہیں کرنی چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔

جن دنوں میں اسلامیہ کالج برائے خواتین کُوپر روڈ میں پڑھا رہی تھی، ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہم اپنے گھر اچھرہ موڑ سے کالج کُوپر روڈ، اَومنی بس سروس کے ذریعے ہی آتے جاتے تھے۔ راستے میں کئی اور اساتذہ بھی ساتھ مل جاتی تھیں۔ ایک روز واپسی کے وقت ہم بیڈن روڈ سے گزر کر ریگل کے بس اسٹاپ پر آئے اور بس کا انتظار کرنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب محترمہ فاطمہ جناح پاکستان کے صدارتی انتخاب میں جنرل محمد ایوب خان کے مقابلے میں صدارتی امیدوار تھیں اور ابا جان نے محترمہ فاطمہ جناح کی بھر پور حمایت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس بنا پر حکومتی حلقوں کے ساتھ مذہبی طبقوں میں بھی ان کی مخالفت ہو رہی تھی کہ ان جیسے دینی رہنما کو عورت کی حاکمیت کی حمایت نہیں کرنی چاہیے۔

ہم بس اسٹاپ پر کھڑے تھے کہ کچھ اور لوگ بھی بس کے انتظار میں وہاں آ گئے اور ان کے مابین سیاست پر گرما گرم بحث چل نکلی۔ یکایک ایسی گالیاں میرے والد کو پڑنے لگیں کہ ہم ہکا بکا رہ گئے۔ میری ایک ساتھی نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا: ”آؤ ہم گنگا رام بس اسٹاپ پر چلتے ہیں، وہیں سے بس لے لیں گے۔“ میں نے پوچھا: ”کیوں، یہاں سے کیوں نہیں؟“ اس نے انگریزی میں کہا: ”یہ گفتگو جو ہو رہی ہے، کیا تم اسے برداشت کر سکتی ہو؟“

چونکہ اس نے یہ بات انگریزی میں کہی تھی، اس لیے میں نے بھی انگریزی ہی میں اسے کہا: "یہ جو گالیاں میرے باپ کو دی جا رہی ہیں، یہ میرے ابا جان کو نہیں دی جا رہیں۔ اگر وہ صرف میرے والد ہوتے تو کوئی انہیں گالی نہ دیتا۔ یہ گالیاں تو ایک دینی رہنما اور سیاسی لیڈر کو دی جا رہی ہیں، اس لیے ان سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" یہ کہتے کہتے غصے اور دکھ سے میری آواز ذرا بلند ہو گئی۔ اتفاق سے سفید پتلون اور کالے کوٹ والے ایک صاحب جو غالباً وکیل تھے اور ہم سے ذرا قریب کھڑے تھے، ان کے کانوں میں یہ بات پڑی تو وہ ان گالیاں دینے والوں کی طرف لپکے اور کہا: "او میاں! او بھائی! ذرا سنبھل کر بات کرو۔" ابھی وہ صاحب معلوم نہیں کیا کہتے کہ سامنے سے اَومنی بس آ گئی اور ہم اس میں سوار ہو گئیں۔

دوسرے دن میری اس ساتھی لیکچرار نے اسٹاف روم میں موجود لوگوں کو یہ سارا قصہ سنا دیا اور مجھے مخاطب کر کے کہا: "تم تو مجھے کوئی پتھر کی بنی ہوئی چیز معلوم ہوتی ہو۔ بھلا کوئی بیٹی اپنے باپ اور وہ بھی ایسے باپ کے خلاف اس طرح کی گالیاں سن سکتی ہے؟ اور تم اس طرح اطمینان سے کھڑی تھیں جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی!" میں نے جواب میں کہا تھا: "بہن، میں پتھر کی نہیں ہوں بلکہ آپ جیسی ہی ہوں، البتہ ہم بہن بھائیوں نے اپنے آپ کو پتھر کا بنا لیا ہے۔" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا: "جب میں ہائی اسکول میں نویں جماعت میں پڑھتی تھی، اس وقت میرے والد قید با مشقت کاٹ رہے تھے۔ انہیں جیل میں چرخہ کاتنے کو دیا گیا تھا اور یہ خبر اخبارات میں نمایاں طور پر چھپی تھی۔ اس وقت میری ایک کلاس فیلو لڑکی نے سخت طنزیہ لہجے میں مجھ سے پوچھا تھا: "تمھارے ابا جی نے جیل سے جو کھیس تیار کر کے بھیجا ہے، وہ ہمیں کب لا کر دکھاؤ گی؟" ایک طرف ہم دکھی تھے اور دوسری جانب یہ طنز، میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور سچی بات ہے جواب دیتی بھی کیا؟ لیکن اسی وقت سے میں نے بلکہ ہم سب بہن بھائیوں نے تقریباً ایسی باتیں سن سن کر خود کو پتھر بنا لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے شدید ناموافق (abnormal) حالات میں رہتے ہوئے بھی ہم سب معمول کے مطابق (normal) رہے۔ شکر الحمد للہ کہ مخالفین کی اذیت ناک باتوں سے ہمارا کچھ بھی نہ بگڑا۔ پھر میں نے ان لیکچرار ساتھیوں کو اپنی اماں جان کی وہ نصیحت بھی سنائی جو انہوں نے ہمیں بہت برس پہلے ذہن نشین کرائی تھی۔ انہوں نے کہا تھا: "اپنے آپ کو صبر کا پہاڑ بنا لو، پہاڑ کہ جس سے بڑے بڑے طوفان آن کر ٹکراتے ہیں مگر وہ اپنی جگہ ویسا ہی کھڑا رہتا ہے۔ خود کو سمندر بنا لو جس میں بڑے بڑے دریا آ کر گرتے ہیں مگر وہ اپنے کناروں میں سمایا رہتا ہے اور کبھی کنارے توڑ کر باہر نہیں نکلتا ہے۔ باقی رہیں یہ گالیاں اور فضولیات تو یہ ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہیں، یہ تو روز کا کھیل ہیں؟"

اسلامیہ کالج برائے خواتین کی اساتذہ یہ سن کر کہنے لگیں کہ: "تمہاری والدہ یقیناً بہت عظیم خاتون ہیں۔ سازگار حالات میں تو سب ہی بڑے اچھے ہوتے ہیں، اصل عظمت تو اس وقت سامنے آتی ہے جب ایسے نا سازگار حالات میں کوئی خاتون اپنے آپ کو نارمل رکھے اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرے اور اپنے بچوں کی ایسی تربیت کرے۔"

بچوں کے لیے تو ان کا باپ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ باہر کے لوگ بس یہی جانتے تھے کہ یہ مولانا مودودی صاحب ہیں لیکن ہم بہن بھائی تو ان کو صرف ابا جان کی حیثیت سے جانتے تھے کیونکہ گھر کے فرد کی حیثیت سے انہوں نے ہم کو کبھی اپنے غیر معمولی انسان یا کوئی بڑا آدمی ہونے کا احساس تک نہیں ہونے دیا تھا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ جب وہ جیل جاتے تو ہم چھوٹے بچے اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کیا کرتے تھے۔ ہم سوچا کرتے تھے کاش، گھر کے کسی کونے میں ان کا کوئی بت ہی کھڑا ہو، جسے ہم باپ کہہ سکیں لیکن اس کے باوجود ہمیں یہ احساس ہوتا تھا کہ ابا جان کوئی اہم کام کر رہے ہیں، جس کے باعث انہیں بار بار جیل جانا پڑتا ہے مگر اس اہم کام کا تصور ہمارے ذہنوں میں کوئی واضح تصویر نہ بنا سکتا تھا۔

ایک مرتبہ جب ابا جان جیل گئے تو میری چھوٹی بہن عائشہ نے اسکول میں اپنی ہم جماعت لڑکی سے پوچھا: "کبھی تمھارے ابو جیل گئے ہیں؟" اس لڑکی نے تنک کر جواب دیا: "کیوں، ہمارے ابو کوئی چور ہیں جو جیل جائیں۔" عائشہ نے معصومیت سے کہا: "میرے ابو تو جیل میں ہیں۔" لڑکی نے فوراً کہا: "ہوں، پھر تمھارے ابو کوئی چور ہوں گے۔" ساتھ کھڑی دوسری لڑکی نے گرہ لگائی: "اگر چور نہیں تو بڑے سمگلر ہوں گے۔" اس روز یہ باتیں سن کر عائشہ گھر آئی تو خوب چیخی اور چلائی۔

سنہ 1966ء کی بات ہے، رمضان کا مہینہ تھا اور تراویح کا وقت۔ لوگ تراویح کے لیے جمع ہو رہے تھے کہ اچانک اچھرہ پولیس اسٹیشن سے تھانے دار، دو سپاہیوں کے ساتھ ہمارے گھر آیا اور پیغام دیا کہ مجھے مولانا صاحب سے ایک بہت ضروری بات بالکل تنہائی میں کرنی ہے۔ ابا جان نے اپنے دفتر میں بلوا لیا۔

تھانے دار نے سپاہیوں کو باہر چھوڑا اور اندر آ کر ابا جان سے کہا: "مجھے اوپر سے حکم ملا ہے کہ پولیس کی گارڈ لے کر جس میں زنانہ پولیس بھی ہو، مولانا مودودی کے گھر میں چھاپہ مارو۔ ان کے گھر کے سرونٹ کوارٹر میں ایک اغوا شدہ لڑکی ہے، اسے برآمد کرو۔ فوٹو گرافروں سے اس کی تصویریں اترواؤ اور وہیں اخباری نمائندوں کو ساری تفصیلات سے آگاہ کرو!" یہ کہہ کر اس تھانے دار نے کہا: "مولانا، مجھے آپ کی عزت اپنی عزت کی طرح پیاری ہے، میں جلدی سے آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ اپنے گھر کے سرونٹ کوارٹر کی تلاشی لے لیں اور اگر وہاں کوئی لڑکی ہے تو اسے برآمد کر کے بھگا دیں۔ میں اب جا رہا ہوں اور بس پندرہ منٹ کے اندر اندر میں پولیس کی گارڈ، اخباری نمائندوں اور فوٹو گرافروں کے ساتھ آپ کے گھر آؤں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی اور آپ کے بیٹوں کی عزت بچ جائے، کیونکہ الزام آپ کے کسی بیٹے پر لگے گا!"

ابا جان یہ سن کر اندر آئے اور راز داری کے ساتھ ساری بات اماں جان کو بتا دی۔ اماں جان سرونٹ کوارٹر میں گئیں۔ نوکروں نے انہیں باتوں باتوں میں ٹال دیا کہ نہیں، بیگم صاحبہ! ایسا کیسے ہو سکتا ہے، آخر ہم نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ آپ کا اور میاں جی کا تو جہاں پسینہ گرے ہم اپنا خون بہانے کو تیار ہیں۔"

ادھر وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا کہ یکدم میرے بھائی حسین فاروق اور محمد فاروق سرونٹ کوارٹر میں گھس گئے اور جب تلاشی لی تو دیکھا کہ ہماری کھانا پکانے والی مائی کی ایک رشتے دار لڑکی وہاں موجود تھی۔ مائی اور اس لڑکی کو اسی وقت وہاں سے نکال باہر کیا اور بھگا دیا۔ گھر کے ایک گیٹ سے وہ دونوں باہر نکلیں اور دوسرے گیٹ سے پولیس کی گاڑیاں داخل ہوئیں۔ زنانہ پولیس نے اندر پورے گھر کی تلاشی لی اور مردانہ پولیس نے سرونٹ کوارٹر پر دھاوا بول دیا لیکن وہاں کوئی لڑکی ہوتی تو برآمد ہوتی۔ یہ واقعہ ایوب خاں صاحب کے زمانہ صدارت میں پیش آیا تھا۔

اس تکلیف دہ زمانے میں یہ مثال بڑی اُمید افزا تھی کہ اگر بڑے بڑے سرکاری افسر چاپلوس، خوشامدی اور ضمیر فروش ہیں تو کیا ہوا۔ اس قوم میں اچھرہ پولیس اسٹیشن کے تھانے دار جیسے دیانت دار اور دوسروں کی عزت کو اپنی عزت کی طرح عزیز رکھنے والے نایاب انسان بھی تو موجود ہیں۔ اگر کہیں اس نیک نفس پولیس افسر نے اپنی ترقی اور مستقبل کو خطرے میں ڈالتے ہوئے قبل از وقت ابا جان کو خبر دار نہ کیا ہوتا تو دوسرے دن اخباروں میں کیسی کیسی سرخیاں سجائی جاتیں۔

اس تھانے دار نے بتایا تھا کہ: "مولانا، آپ کے کچھ ذاتی ملازم روز رات کو تھانے میں آ کر پورے دن کی رپورٹ دیتے ہیں۔ جتنی تنخواہ آپ ان کو دیتے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ تنخواہ وہ تھانے سے لیتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ وہی ملازمین تھے جو میاں جی کے پسینے کی جگہ اپنا خون بہانے کا دعویٰ کر رہے

تھے۔ یہ اطلاع ملنے کے باوجود ابا جان نے گھر کے کسی ملازم کو فارغ نہیں کیا کہ جو نئے ملازم آئیں گے، وہ بھی تو انہی کی طرح تھانے میں رپورٹ دیں گے۔

ہم اس وقت اسکول کی تعلیم مکمل کر کے کالج میں پہنچ چکے تھے۔ تب، خود ساختہ صدر جنرل ایوب خان کا اقتدار پورے عروج پر تھا۔ ابا جان کے خلاف پروپیگینڈا مہم زوروں پر تھی۔ اخبارات میں سرخیاں لگتیں کہ مولانا مودودی غدار ہیں، وہ پاکستان کے مخالف تھے۔ لاہور کالج برائے خواتین میں قدم رکھتے ہی کسی نہ کسی طرف سے یہ آوازے ضرور کسے جاتے: "مردودی مردودی۔ ایک مودودی سو یہودی۔ مودودی ٹھاہ وغیرہ۔ بلاشبہ ہمارے لیے یہ باتیں سخت تکلیف دہ تھیں۔ تاہم، جب بھی ہم اس بات کا تذکرہ ابا جان سے کرتے تو ان تکلیف دہ باتوں کے جواب میں وہ اکثر یہ شعر پڑھتے تھے:

در کوئے نیک نامی مارا گزر نہ دادند

گر تو نمی پسندی، تغییر کن قضا را

(ترجمہ) نیک نامی کے کوچے میں تو ہمیں (وہ) قدم ہی نہیں رکھنے دیتے، اگر تجھے یہ بات پسند نہیں ہے تو تقدیر بدل دے۔

ادھر ہماری اماں جان نے ہمیں سمجھا دیا تھا: "اگر پڑھنا ہے تو انہی حالات میں اور انہی لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھو ورنہ جاہل رہ جاؤ گے۔ بازار کی گالی ہنس کر ٹالی، کا اصول یاد رکھنا۔" ساتھ ہی اماں جان نے یہ بھی ہمیں اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا کہ گالی کے جواب میں گالی کبھی نہ دینا۔ ان کا کہنا تھا: "ایک چپ ہزار جواب ہے۔ گندے پانی میں اینٹ پھینکو گے تو اپنے کپڑوں پر چھینٹے پڑیں گے۔ اس لیے کبھی کسی کی سخت بات کا سخت جواب نہ دینا۔" بہن بھائیوں میں سے صرف مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے ابا جان سے براہ راست پڑھا بھی ہے۔ میٹرک میں نے فارسی کے ساتھ کیا تھا۔ کالج میں پہنچ کر اماں جان نے مجھے لازمی مضمون کے طور پر عربی دلوا دی۔ عربی مجھے تھوڑی بہت اس لیے آتی تھی کہ قرآن شریف ترجمے سے پڑھا تھا۔ لہذا فرسٹ ایئر میں، میں نے اپنی تعلیمی ضروریات کے لیے ابا جان سے عربی پڑھی تھی۔۔۔ صورت یہ ہوتی کہ جس وقت دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد، وہ آرام کے لیے لیٹ جاتے تو میں اپنی کتابیں لے کر ان کے پاس بیٹھ جاتی تھی۔ تب انہوں نے مجھے عربی گرامر اور متعلقہ اسباق پڑھائے اور کچھ گردانیں بھی یاد کروائیں۔ اسی طرح مضمون اسلامیات میں سے سورۃ الاحزاب کا ترجمہ و تفسیر کا سبق بھی میں نے انہی سے پڑھا۔

جب دوپہر یا رات کے وقت ابا جان کھانا کھانے کے لیے گھر کے اندر آتے تھے تو لکھتے لکھتے اپنے قلم، کاغذات اور مسودات کو لکھنے کی میز پر اسی طرح چھوڑ دیتے تھے۔ تب اسکول کے زمانے میں، میں جلدی سے ان کے دفتر میں جا کر ان لکھے ہوئے کاغذات کو الٹ پلٹ کر پڑھتی تھی کہ وہ آج کل کیا لکھ رہے ہیں۔ چونکہ حافظہ اچھا تھا اس لیے ایک دو بار پڑھنے سے عبارت کا خاصا حصہ زبانی یاد ہو جاتا تھا لیکن میری یہ سرگرمی کسی پر کھلی نہیں تھی۔ ایک دن کھانا کھاتے ہوئے کوئی بات چھڑی تو موقعے کی مناسبت سے مجھ سے چپ رہا نہ گیا اور میں نے ابا جان کا لکھا ہوا ایک پیراگراف انہی کے اسٹائل میں انہیں سنا دیا۔ یہ سن کر ابا جان تو دنگ رہ گئے اور مجھ سے پوچھا: "ہائیں، اس کی ہوا تمہیں کیسے لگی؟ یہ تو میں نے ابھی کل رات کو لکھا ہے؟"

میں نے جواب دیا: "میں تو روز آپ کے دفتر میں جا کر آپ کے کاغذات پڑھتی ہوں۔ مجھے سب معلوم ہے کہ آپ آج کل کیا لکھ رہے ہیں!" ابا جان حیران پریشان بڑی معصومیت سے میری طرف دیکھ کر کہہ رہے تھے: "اچھا! اچھا!" لیکن مجھے معلوم تھا کہ ابا جان اندر سے خوش تھے، اگرچہ بظاہر خنکی ظاہر کر رہے تھے۔

اس واقعے کے چند روز بعد دادی اماں نے ابا جان سے کہا: "اوپر کی منزل میں جن رہتا ہے!" ابا جان نے جواب دیا: "اماں بی، آپ ایک جن کی بات کر

رہی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہاں نو جن رہتے ہیں اور ان جنات میں سے ایک قسم تو ایسی بھی ہے کہ وہ میرے کاغذات تک کو بخشنے کے لیے تیار نہیں۔ میری غیر موجودگی میں میرا لکھا ہوا پڑھا جاتا ہے اور یاد کر کے میرے ہی اسٹائل میں مجھ کو سنایا بھی جاتا ہے۔ یہاں تو ایسے ایسے جن ہیں جو میرے قلم تک کے دربان بنے ہوئے ہیں۔ مجال ہے کہ زیر زبر کی بھی غلطی کر جائیں۔ اس واقعے کے پندرہ سولہ برس بعد، جب میں گرمیوں کی چھٹیوں میں جدہ سے پاکستان آئی ہوئی تھی، اماں جان نے مجھے ایک درس قرآن دینے کے لیے اپنی جگہ بھیج دیا۔ وہ لاہور میں میرا پہلا درس تھا۔ بعد میں وہاں سے اماں جان کے پاس فون آیا: ''بیگم صاحبہ، آپ کی بیٹی نے بہت اچھا درس دیا ہے، ہمارا تو خیال تھا یہ انگریزی پڑھاتی ہے بھلا کیا درس دے گی، بس بیگم صاحبہ نے خانہ پری کے لیے اپنی بیٹی کو بھیج دیا ہے لیکن ہم تو حیران ہی رہ گئے۔''

جب یہ بات ابا جان نے سنی تو مجھے بلا کر پوچھا: ''ذرا بتاؤ تو سہی تم وہاں کیا گڑ بڑ کر آئی ہو؟'' میں نے جواب دیا: ''آپ کے جو پیرا گراف میں نے اسکول کے زمانے سے یاد کر رکھے ہیں، بس وہی دہرا دیے۔ کچھ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور علامہ اقبال کے کچھ اشعار یاد ہیں، باقی آپ کے پیرا گراف مدد دیتے ہیں۔ اگر میں کہیں پھنس جاتی ہوں تو انہی کی مدد سے کام چلا لیتی ہوں۔ آپ کے یہ اقتباسات لکھنے میں بھی کام دے جاتے ہیں اور درس میں بھی مدد دیتے ہیں۔''

میں تو اپنی رو میں بولے جا رہی تھی، ادھر ابا جان دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے سن رہے تھے اور حیران پریشان میری طرف دیکھے جا رہے تھے۔ بعد میں اسما نے مجھ سے کہا: ''ابا جان سے ایسی باتیں صرف تم کر سکتی ہو؟''

چونکہ میں نے تفہیم القرآن کا مطالعہ اس وقت کیا جب وہ لکھی جا رہی تھی، اس لیے آج بھی ان حصوں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ صاحب تفہیم القرآن لکھتے لکھتے قلم رکھ کر بس ابھی ابھی کہیں گئے ہیں، واپس آ کر لکھنا شروع کر دیں گے۔ ابا جان کے کردار کی یہ خوبی مجھے بہت زیادہ یاد آتی ہے کہ بلا مبالغہ وہ اپنے بچوں کی اتنی عزت کیا کرتے تھے جتنی دوسرے لوگ ماں باپ کی کرتے ہیں۔ عام حالات میں وہ ہمیں بیٹی کہا کرتے تھے۔ ذرا رنجیدہ ہوتے تو صاحبزادی کہا کرتے اور اگر بہت ہی زیادہ ناراض ہوتے تو پھر صاحبزادی صاحبہ کہتے۔ پکارنے کا یہ انداز ہی ہمارے لیے ایک تازیانہ ہوتا تھا اور ہماری کوشش ہوتی کہ صاحبزادی صاحبہ کہنے کی نوبت ہی نہ آئے۔

انہی دنوں کی بات ہے، فلسطین سے مسلمانوں کا ایک وفد لاہور آیا اور ابا جان سے ملنے کا خواہش مند ہوا۔ ان کو شام کی چائے پر مدعو کیا گیا۔ ہمارے گھر آنے سے چند گھنٹے پہلے اطلاع ملی کہ ان کے ساتھ کچھ خواتین بھی ہوں گی۔ ہمارے گھر میں مخلوط محفل کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ابا جان نے فوری طور پر خواتین کے لیے اندر کے لان میں انتظام کروایا اور ہمیں ہدایت کی کہ آپ لوگ ہی سب مہمان خواتین کی خاطر مدارات کریں گی۔

یہ برسات کا موسم تھا۔ جس وقت ٹینٹ سروس والے میزیں لگا رہے تھے، کالی سیاہ گھٹا امڈ امڈ کر چھا گئی۔ ایسے لگتا تھا کہ بارش بس شروع ہونے ہی والی ہے۔ ہم لوگ بہت گھبرا گئے اور ابا جان سے کہا: ''اگر باہر مہمان خواتین کو بٹھایا اور بارش شروع ہو گئی تو کس قدر بھگدڑ مچے گی۔'' ابا جان نے نہایت اطمینان سے کہا: ''ان شاء اللہ، بارش نہیں ہو گی۔'' ہم نے کہا: ''بارش تو بالکل تیار کھڑی ہے۔'' ابا جان نے پھر اسی اطمینان سے زور دے کر کہا: ''کہا نا، ان شاء اللہ بارش نہیں ہو گی۔'' اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے گھٹا چھٹ گئی اور صاف نیلا آسمان نکل آیا۔ ایسی خوش گوار ہوا چلی کہ دل خوش ہو گیا۔ مہمان آئے، آرام سے بیٹھے، چائے پی اور چلے گئے۔ جب سب مہمان چلے گئے اور ساری چیزیں اٹھالی گئیں تو بادل پھر گھر کر آ گیا۔ اس کے بعد تمام رات موسلا دھار بارش ہوئی، چھاجوں مینہ برسا۔ اس وقت ہماری اماں جان نے ہم سے کہا: ''دیکھو، یہ جو کچھ کہہ دیا کریں اسے چپ چاپ سن لیا کرو۔ بحث نہ کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ اکثر ان کی بات پوری کر دیتا ہے۔''

پھر اماں جان نے ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دو احادیث سنائیں:

1۔ "حضرت انسؓ کی روایت کردہ حدیث: اللہ کے بندوں میں بعض ایسے ہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر قسم کھا لیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم پوری کر دیتا ہے۔

2۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہت سے پراگندہ بالوں والے جن کے لیے دروازے نہیں کھولے جاتے، ایسے ہیں کہ اگر وہ اللہ پر قسم کھا لیں تو اللہ تعالیٰ ان کو اس قسم میں سچا کر دیتا ہے۔

ایک انوکھا تجربہ مجھے اس وقت ہوا، جب میں شادی کے بعد مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں رہ کر کچھ دن کے لیے لاہور آئی تھی۔ میں جیسور میں لڑکیوں کے کالج میں انگریزی پڑھاتی تھی۔ میں نے آ کر ابا جان سے کہا: "مجھے یوں لگتا ہے کہ آپ لوگوں کو کام کرنا آتا ہی نہیں۔"

ابا جان یہ سن کر ایک دم متوجہ ہوئے اور پوچھا: "اچھا تو صاحبزادی صاحبہ فرمائیے! مجھے کس طرح کام کرنا چاہیے تھا؟" ہماری اماں جان سٹپٹا گئیں کہ باپ بیٹی میں یہ کس طرح کی گفتگو ہو رہی ہے۔

میں نے ابا جان کو بتایا: "آپ کو ہم وطنوں میں پاکستانیت اور اسلامیت کے لیے اس طرح کام کرنا چاہیے، جس لگن سے مشرقی پاکستان میں ہندو بنگالی قوم پرستی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے میں نے بتایا: "جب میں جیسور پہنچی تو کچھ دنوں بعد وہاں لڑکیوں کے کالج کی پرنسپل صاحبہ نے مجھے فون کیا اور کہا: "ہمیں انگریزی کی لیکچرار کی ضرورت ہے اور ہمیں اطلاع ملی ہے کہ تم انگریزی میں ایم اے ہو اور کالج میں پڑھانے کا تجربہ بھی رکھتی ہو۔ جب میں نے ٹالنے کی کوشش کی تو انہوں نے کہا: "ملنے ہی آ جاؤ، بیٹھ کر چائے پیئیں گے اور مغربی پاکستان کی باتیں کریں گے۔" یہ سن کر میں ان سے ملنے چلی گئی۔

جب میں پرنسپل صاحبہ کے دفتر پہنچی تو کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد انہوں نے اپنا پرس اٹھایا اور مجھے دکھا کر کہا: "اے لڑکی لوگ دیکھو، میرے خاوند کی چٹا گانگ میں ایک اور کھلنا میں دو پٹ سن (jute) کی ملیں ہیں۔ میں اپنے اس پرس سے اس سکول اور کالج کو خرید سکتی ہوں، جس میں مَیں اس وقت کام کر رہی ہوں۔ چونکہ میرے سامنے ایک "مقصد" ہے، اس لیے میں یہاں کام کرتی ہوں، اگرچہ مجھے پیسوں کی کچھ ایسی ضرورت نہیں ہے۔" کچھ دیر بعد موصوفہ نے یہ گوہر افشانی بھی کی کہ جناح صاحب (قائد اعظم) نے قیام پاکستان کے بعد ڈھاکا یونیورسٹی میں تقریر کے دوران میں جب یہ کہا تھا: "پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہو گی تو میں اس وقت وہاں پڑھ رہی تھی۔ وہاں جن لوگوں نے ان کی تقریر کے دوران میں ان پر ہوٹنگ کی، ان میں مَیں بھی پیش پیش تھی۔

ان پرنسپل صاحبہ کی کچھ مزید الٹی سیدھی باتیں سن کر تو میرا دماغ چکرا سا گیا اور میں نے فوری طور کہہ دیا: "ٹھیک ہے میں آپ کے کالج میں پڑھاؤں گی۔" دراصل میں ان کے مقاصد کو سمجھنا چاہتی تھی۔ انہوں نے باتوں ہی باتوں میں مجھ پر طنزیہ انداز میں یہ چوٹ کی تھی کہ: "تم لوگ روٹی کی خاطر کام کرتے ہو، جبکہ ہم روٹی سے بے نیاز ہو کر اپنے مقصد کی خاطر کام کرتے ہیں۔" بہر حال جب میں نے کالج سے وابستگی اختیار کر لی اور تدریسی عملے کے ساتھ ذرا تعلق بڑھا تو یہ حیران کن انکشاف ہوا کہ وہاں زیادہ تر استاد ہندو ہیں، جو عیسائی ناموں کے ساتھ وہاں کام کر رہے تھے۔ جو لیکچرار صاحبہ اسلامیات پڑھا رہی تھیں، وہ بھی ہندو تھیں۔ ایک پیریڈ ناچ گانے کی تربیت کا بھی ہوتا تھا اور ایک ہندو مہاراج آ کر مسلمان بچیوں کو کتھک ڈانس کی تربیت دیتے تھے اور گانے کا ریاض بھی کرواتے تھے۔ سب بچیوں کے بستوں میں کتابوں کے ساتھ ساتھ گھنگھرو بھی آتے تھے۔

میں نے وہاں کے کچھ درد مند مسلم گھرانوں تک یہ بات پہنچائی تو انھوں نے میری بات سے سو فی صد اتفاق کرتے ہوئے کہا: "ہم بے بس ہیں۔" قیام پاکستان کے بعد سے یہاں پر ہندوؤں نے تعلیم کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ پرائمری سے لے کر یونیورسٹی سطح تک اکثر مضامین ہندو استاد پڑھا رہے ہیں۔ وہ خواہ کوئی مضمون پڑھائیں مگر اس کی آڑ میں پاکستان کی مخالفت، مغربی پاکستان سے نفرت، اور "سونار بنگلہ" کا زہر ضرور بچوں کے دماغوں میں انڈیلتے ہیں۔ رابندرا ناتھ ٹیگور ان کا باوا آدم، شانتی نکیتن یونیورسٹی ان کی جامعہ ازہر اور "سونار بنگلہ" ان کے خوابوں کی جنت ہے۔ یہ سب ان استادوں ہی کا کیا دھرا ہے۔ کُل ہند مسلم لیگ کے وہ لوگ جو کل تک تحریک پاکستان کی قیادت کر رہے تھے، آج وہی آگے بڑھ کر ہندو قوم پرستوں کی ناز برداری کرنے اور پاکستان کو بُرا کہنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے۔ پھر سیاسی سطح پر انھیں مقبولیت بھی حاصل ہے۔ چونکہ ہم "اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہے" کے قائل ہیں، اس لیے خاموش رہنے اور اپنے بچوں کو ان کے سپرد کرنے پر مجبور ہیں۔

یہ تمام حالات اور مشاہدات بیان کرنے کے بعد میں نے ابا جان کو یاد دلایا کہ آپ نے خود ترجمان القرآن میں یہ لکھا تھا: "اسلامی نظام قائم کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعے سے اس میں خالص اسلامی شعور کو بہ تدریج اس حد تک نشو و نما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آ جائے۔"

پھر میں نے عرض کیا: "اسلامی شعور تو اچھی کتابوں کے مطالعے سے یا تربیت سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر قیام پاکستان کے بعد، اسکولوں اور کالجوں میں صرف ایسے اساتذہ کو مقرر کیا جاتا جن کا اپنا ذہن بھی دین کے بارے میں صاف ہوتا، عقیدہ پختہ ہوتا اور وہ اردو تعلیم و تدریس کے لیے نئی نسل کی ذہنی تربیت کی فکر کرتے۔ اس طرح اگر تمام مسجدوں میں تعمیری اور صحیح اسلامی سوچ کے حامل خطیب حضرات کو مقرر کیا جاتا تو اب تک ایک ایسی نسل تیار ہو جاتی جو اسلامی جذبے سے سرشار ہوتی اور ہر شعبے میں اپنی کثرت تعداد کی بنا پر اسلامی انقلاب کا واقعی ہر اول دستہ بن جاتی۔ بالکل اسی طرح جیسے مشرقی پاکستان میں ہر گھرانے کے بزرگ تو خالص پاکستانی تھے لیکن ان کے بچے صرف بنگالی قوم پرست بنتے جا رہے ہیں اور پاکستان کا نام تک سننے کے روادار نہیں۔"

ابا جان میری باتیں سنتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ میں کچھ دیر خاموش رہی۔ تھوڑے توقف کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ: "بیٹی، اسلامی نظام قائم ہو سکتا تھا، بشرطیکہ تقسیم کے وقت جن لوگوں کے ہاتھوں میں زمام کار تھی، وہ اپنے ان وعدوں کے بارے میں جو انھوں نے قیام پاکستان سے پہلے تحریک پاکستان کے دوران میں اپنی قوم سے کیے تھے، اتنے صادق ہوتے کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی ضرورت اور اہمیت محسوس کرتے۔

میں نے ابا جان سے کہا کہ اپنے وقت میں شانتی نکیتن یونیورسٹی، ہندو استادوں کا شاہکار تھی۔ یہ وہ نسل ہے جو پرائمری سطح سے ہندو استادوں کی تربیت یافتہ ہے۔ آج کسی میں جرات نہیں کہ اس یونیورسٹی کے تیار کردہ لوگوں یا ان کی پیدا کردہ سوچ سے ٹکر لے سکے۔ اسی طرح اگر تربیت یافتہ علمائے کرام تمام مسجدوں میں ہر جمعے کے خطبے میں دین کا فہم قوم کے دل و دماغ میں اتارتے تو بغیر کسی سیاسی ٹکراؤ کے قوم خالص دین کے فہم سے سرشار ہوتی۔ اور اس کے نتیجے میں پوری قوم سیسہ پلائی دیوار کی طرح ہوتی۔" ابا جان نے مجھ سے اتفاق کیا۔

میری بیٹی رابعہ سے ابا جان بہت پیار کرتے تھے۔ یہ 1970ء کی بات ہے کہ ایک روز ہم اسے لے کر خریداری کے لیے انار کلی بازار گئے تو سامنے سے پیپلز پارٹی کا ایک پر جوش جلوس آ گیا۔ جلوس میں ابا جان کو گالیاں دی جا رہی تھیں۔ ہم یہ دیکھ کر فوراً واپس گھر آ گئے۔ دوپہر کو جب ابا جان کھانا کھانے گھر میں آئے تو ان کے بالکل ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر بیٹی رابعہ نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا اور پوچھا: "نانا ابا، مولانا مودودی آپ ہی ہیں نا؟" کہنے لگے: "ہاں، بیٹی میں ہی ہوں۔"

اس پر رابعہ بولی: "نانا ابا، انار کلی میں تو مولانا مودودی کو گالیاں دی جا رہی تھیں۔" نواسی کی یہ بات سن کر ابا جان مسکرا کر پوچھنے لگے: "اچھا، آپ نے سنی تھیں۔" اس پر میں نے ڈانٹ کر رابعہ کو چپ کرایا اور ابا جان سے کہا: "آپ خوش تو ایسے ہو رہے ہیں جیسے گالیاں نہیں پڑیں، بلکہ آپ کو کوئی خزانہ مل گیا ہے۔"

میری یہ بات سن کر ابا جان سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے: "بیٹی، میں نے تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ابھی صرف گالیاں ہی کھائی ہیں، پیغمبروں اور اللہ کے نیکو کار لوگوں نے تو پتھر بھی کھائے ہیں۔ یہ اللہ کی راہ میں پڑنے والی گالیاں ہیں اور یہ انبیا کی سنت ہیں۔ یہ ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتی ہیں۔"

ایک مرتبہ ایک صاحب ہمارے ہاں تشریف لائے۔ انہوں نے ابا جان کو ایک غیر ملکی ساخت کا قلم دیا اور کہا: "یہ تحفہ ایک روسی باشندے نے آپ کو بھجوایا ہے۔" معلوم ہوا کہ وہ صاحب چند ماہ پیش تر تاشقند گئے تھے، وہاں ایک ممتاز مقامی باشندے نے علیحدگی میں انہیں بتایا کہ میں مسلمان ہوں! اور پھر اس نے وہ قلم انہیں دیا اور فرمائش کی کہ پاکستان جا کر وہ اس قلم کو ابا جان تک پہنچا دیں۔

سنہ 1968ء میں ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے طالب علموں کو کالجوں سے نکالا اور سڑکوں پر لا کر مظاہرے کروائے۔ اسی طرح مزدوروں کو فیکٹریوں سے نکال کر سڑکوں پر نعرے لگوائے۔ اس صورت حال پر ابا جان نے دل گرفتہ ہو کر اخبارات میں بیان جاری کیا کہ: "ایک بار طالب علموں کو کلاسوں سے اٹھا کر سڑکوں پر لانا اور ان سے نعرے لگوا کر مظاہرے کروانا آسان ہے۔ کل جب آپ چاہیں گے کہ یہ بچے دوبارہ کلاسوں میں بیٹھ کر پڑھنے لگیں تو یہ ناممکن ہے۔ اس جن کو بوتل ہی میں رہنے دیں۔ یہ ایک بار بوتل سے باہر نکل آیا تو دوبارہ اسے بوتل میں بند کرنا مشکل ہو گا۔ اسی طرح مزدوروں کو ایک بار فیکٹریوں اور کارخانوں سے نکال کر ان سے سڑکوں پر نعرے لگوانا اور مظاہرے کروانا آسان ہے۔ کل جب آپ چاہیں گے کہ یہی مزدور پھر کارخانوں میں جا کر کام کریں تو یہ ناممکن ہو جائے گا۔" ابا جان نے اپیل کی کہ: "خدارا! قوم کے مزاج میں ہلڑ بازی کو مت داخل کیجیے۔ اس سے تعلیم اور صنعت و حرفت کا جنازہ نکل جائے گا۔" لیکن اس زمانے میں قوم کے مزاج میں ایسی ہلڑ بازی داخل ہوئی جو آج ہر طرف نظر آ رہی ہے۔

ابا جان ایک ہمہ گیر شخصیت تھے۔ ہر چند کہ انہوں نے اس قدر سنجیدہ کام کیا جو دوسرے لوگوں کے نزدیک خشک اور بوجھل تصور کیا جاتا ہے مگر وہ اپنی نجی اور مجلسی زندگی میں نہایت باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ ان تمام حوالوں سے میرے آئیڈیل میرے ابا جان تھے۔

ہم نے گھر میں ابا جان کو دکھ اور سکھ ہر حال میں دیکھا ہے لیکن تین مواقع ایسے ہیں جب ابا جان پر دکھ کی شدت کو پوری طرح عیاں حالت میں دیکھا:

• اگست 1947ء کے بعد وہ وقت کہ جب بے سہارا اور لٹی پٹی مسلمان عورتوں کے تذکرے انہوں نے براہ راست سنے اور ایسی مجبور و مظلوم لڑکیوں کی حالت زار انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی۔

• دوسرا موقع وہ تھا، جب 29 اگست 1966ء کو سید قطبؒ کو مصر کے ایک سفاک آمر مطلق صدر جمال ناصر نے پھانسی دی تھی۔

• اور تیسرا موقع تھا 16 دسمبر 1971ء سقوطِ ڈھاکا۔ اس تیسرے سانحے سے ابا جان کے قلب و روح پر کیا گزری؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں دل کا پہلا دورہ اسی حادثے کے چند روز بعد پڑا تھا۔ وہ کہتے تھے: "مشرقی پاکستان کبھی الگ نہ ہوتا مگر مغربی پاکستان کے مقتدر طبقوں نے اسے دھکے دے دے کر الگ کیا ہے اور ہندوستان نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

فروری 1974ء میں لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس ہوئی تو سعودی عرب کے فرماں روا شاہ فیصل بن عبد العزیز نے خاص طور پر ابا جان کے بارے میں پوچھا۔ اسی لیے آخری وقت میں بھٹو صاحب نے انہیں کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ بھیجا۔ کانفرنس شروع ہوئی اور ابا جان ابھی کانفرنس ہال (پنجاب

اسمبلی ہال) کی سیڑھیوں پر قدم رکھ ہی رہے تھے تو انہیں معلوم ہوا کہ اس کانفرنس میں شیخ مجیب الرحمن کے سامنے بھٹو صاحب بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اعلان کرنے والے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ انہی قدموں پر ابا جان یہ کہتے ہوئے واپس گھر چلے آئے کہ: "جس شیخ مجیب نے پاکستان توڑنے کی سازش میں ایک مہرے کے طور پر کام کیا ہے، اس کے ساتھ بیٹھنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔"

7 جون 1972ء کو تفہیم القرآن کی آخری اور چھٹی جلد مکمل ہوئی۔ تفہیم القرآن کی تکمیل کی مناسبت سے جون 1972ء کے آخری دنوں میں فلیٹیز ہوٹل لاہور میں ایک تقریب منعقد ہوئی۔ جس میں معروف قانون دان اے کے بروہی صاحب نے کہا: "مولانا مودودی کی تفہیم القرآن اور ان کے لٹریچر نے لاکھوں مغرب زدہ نوجوانوں کو اسلام کی روح سے آشنا کیا ہے اور ان کی زندگیوں میں انقلاب برپا کیا ہے۔" بروہی صاحب نے مزید کہا: "انسان کی سب سے قیمتی متاع اس کی سیرت و کردار ہے اور اگر کسی آدمی کی سیرت و کردار کو تبدیل کرنا اور اس میں کوئی قابل قدر تغیر برپا کر دینا ممکن ہے تو جو شخص یہ کام سر انجام دیتا ہے، وہ اس آدمی کی زندگی کا معمار ہوتا ہے، سیرت ساز ہوتا ہے اور اس نقطۂ نظر سے میری رائے میں آج پاکستان کے سب سے عظیم انسان مولانا مودودی ہیں۔ میں اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ اگر آج یہ سوال اٹھایا جائے کہ کون سا فرد ہے جس نے پاکستان کے لوگوں کے کردار کو سب سے زیادہ مثبت طور پر متاثر کیا تو میرا جواب ہو گا کہ وہ مولانا مودودی ہیں۔ اگر روز قیامت اللہ تعالیٰ نے مجھے سے گواہی طلب فرمائی تو میں اس وقت بھی یہی گواہی دوں گا جو اب دے رہا ہوں۔" محفل کے دیگر شرکاء نے بھی ابا جان کی دینی خدمات پر عقیدت و اعتراف کے پھول نچھاور کیے۔

اور جب ابا جان کی باری آئی تو انہوں نے نہایت عجز اور انکسار سے کہا: "اگر دنیا بھر میں کسی کام کو قبولیت حاصل ہو اور اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ نا مقبول ہو جائے تو کچھ حاصل نہیں لیکن دنیا میں اگر مقبولیت حاصل نہ ہو اور اللہ کے ہاں وہ مقبول ہو جائے تو یہی اصل کامیابی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں اور آپ بھی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری اس ناچیز خدمت کو قبول فرمائے اور اگر یہ کتاب کسی ایک بندہ خدا کی ہدایت کا بھی ذریعہ بنے تو اسے میری مغفرت کا ذریعہ بنائے۔" پھر فرمایا: "بندہ اپنے رب کے حضور عاجزی کے ساتھ چند اوراق لیے کھڑا ہے کہ یہ غیر تقسیم حق کے لیے ہے اور یہ زندگی شہادت حق کے سوا کسی اور کام کے لیے وقف نہیں رہی اور یہ خدا ہی ہے جو اپنے بندوں کو اس کی توفیق دیتا ہے۔"

ابا جان نے تزکیہ نفس، شہادتِ حق اور اقامتِ دین کی ہمہ گیر جد و جہد کے لیے چو مکھی لڑائی لڑی، جس میں:

- ایک طرف صاحبِ اقتدار لوگوں پر مشتمل گروہ تھا جو پوری ریاستی اور انتظامی مشینری کو ان کے خلاف استعمال کر رہا تھا۔

- دوسری طرف سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام اپنی دولت و سطوت کے ساتھ ان کا مد مقابل تھا۔

- تیسری طرف انہیں مغرب پرستوں، سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے اخلاق سے گرے پروپیگنڈے کا مقابلہ کرنا پڑا۔

- چوتھی طرف مذہبی پیشواؤں کا طبقہ تھا جن کو ابا جان کے مشن کی کامیابی کے نتیجے میں اپنی مذہبی اجارہ داری ڈانواں ڈول ہوتی دکھائی دیتی تھی۔

- پانچویں طرف قادیانی حضرات تھے جو انتہائی رکیک دشنام طرازیوں پر اتر آئے تھے۔

- چھٹی جانب مستشرقین اور ان کے ہم نوا منکرینِ حدیث کا گروہ تھا، جنھوں نے اسلام، قرآن اور در حقیقت صاحبِ قرآن کے بارے میں منفی پروپیگنڈا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اس طرح یہ معرکہ بہت سے محاذوں پر جاری رہا۔ کمزور صحت اور مسلسل بیماری کے باوجود انہوں نے تنِ تنہا وہ کام کیا جو کئی اداروں کے کرنے کا کام تھا۔ وہ بیک وقت ایک جید عالم دین بھی تھے اور ریسرچ اسکالر بھی، مفسر بھی تھے اور مفکر بھی، مورخ بھی تھے اور مبلغ بھی، ایک دانش ور بھی تھے اور صحافی و ادیب بھی اور اس سب کچھ کے ساتھ ساتھ ایک بالغ نظر سیاست دان بھی۔

مارچ 1977ء میں، پیپلز پارٹی کی حکومت نے عام انتخابات میں دھاندلی کی، جس کے خلاف پاکستان قومی اتحاد میں شامل پارٹیوں نے مارچ سے جولائی کے دوران میں بھٹو حکومت کی برطرفی کے لیے ملک گیر مہم چلائی۔ ابا جان نے 2 اپریل کو وزیر اعظم بھٹو صاحب کے سامنے تجویز پیش کی کہ وہ ان متنازع انتخابات کو کالعدم قرار دے کر دوبارہ انتخابات کرانے پر آمادہ ہو جائیں لیکن انہوں نے اس زعم میں کہ "میری کرسی مضبوط ہے" عوام پر لاٹھیاں اور گولیاں برسانا شروع کر دیں۔

آخر کار وسط اپریل میں وہ ابا جان سے ملنے کے لیے ہمارے گھر اچھرہ آئے۔ اس موقع پر ابا جان نے ہمارے گھر کے قریب اسلامی جمعیت طلبہ کے دفتر میں موجود طالب علموں کو ہدایت کی کہ: "بھٹو صاحب میرے مہمان ہیں، ان کی عزت میری عزت ہے اس لیے کوئی نعرے بازی نہیں ہونی چاہیے۔" ملاقات میں بھٹو صاحب کہنے لگے: "مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ جو شرائط چاہیں آپ عائد کر دیں، مجھے منظور ہیں۔"

ابا جان کا جواب تھا: "چونکہ آپ اس قدر آگے جا چکے ہیں کہ اب وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ سے کم پر قوم مطمئن نہیں ہو سکتی۔ پھر منصفانہ انتخاب میں آپ کامیاب ہو کر دوبارہ آ جائیں لیکن موجودہ صورت میں اس کے علاوہ کوئی حل نہیں۔"

45 منٹ کی اس ملاقات میں زیادہ تر بھٹو صاحب ہی بات کرتے رہے۔ کبھی کہا کہ افغانستان کے حالات یہ ہیں، انڈیا میں یہ ہو رہا ہے، بلوچستان میں بے اطمینانی ہے، ایران کے حالات خراب ہو سکتے ہیں، اس صورت حال میں قوم کو میری ضرورت ہے۔

یہ کہہ کر بھٹو صاحب نے پھر پوچھا: "اب آپ بتائیں میں کیا کروں؟"

ابا جان کا جواب تھا: "ان تمام حالات کا بھی یہی تقاضا ہے کہ آپ استعفیٰ دیں، پھر غیر جانب دارانہ اور شفاف انتخابات کرائیں۔ اگر آپ کو اعتماد کا ووٹ ملے تو حکومت میں آئیں۔ اس سے آپ کے اقتدار کا اخلاقی جواز پیدا ہو گا، اسی میں ملک و قوم کا مفاد پوشیدہ ہے اور آپ اور ملک بھی اسی سے مضبوط ہو سکتے ہیں۔ آپ کے بیان کردہ تمام داخلی اور خارجی خطرات سے نمٹنے کا بھی یہی واحد راستہ ہے مگر بھٹو صاحب اس طرف آتے ہی نہیں تھے۔ پھر بھٹو صاحب نے اپنی قومی خدمات کا تذکرہ شروع کیا، جس پر ابا جان نے ان سے کہا: "آپ کی خدمات سے کوئی انکار نہیں ہے لیکن جو چیز غلط ہے، اس کا مداوا خدمات کے تذکرے سے ممکن نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ قوم کسی بڑی تباہی سے دوچار ہو۔ اسی لیے میں آپ سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ مجھے خطرہ ہے کہ آج جو لوگ سڑکوں پر آپ کے استعفے کی بات کر رہے ہیں، آنے والے کل کہیں اس سے آگے بڑھ کر کوئی زیادہ سخت مطالبہ نہ شروع کر دیں۔ اور اگر یہ بحران بڑھ گیا تو پھر بد قسمتی سے مارشل لا کا خطرہ بھی خارج از مکان نہیں اور مارشل لاء تباہی کا پیش خیمہ ہو گا۔"

اس ملاقات کے کچھ ہی دیر بعد، ابا جان نے پریس کانفرنس میں گفتگو کی تفصیلات بیان کیں مگر اس ملاقات کے صرف سات روز بعد بھٹو صاحب نے خود لاہور، کراچی اور حیدر آباد میں مارشل لاء نافذ کر کے فوج کی آمد کا راستہ صاف کر دیا۔

ابا جان کی عادت تھی کہ وہ بڑے لوگوں سے ذرہ برابر مرعوب نہیں ہوتے تھے بلکہ ہمیں نصیحت کیا کرتے تھے کہ: "آدمی کو بحیثیت انسان دیکھنا چاہیے۔ اس کے گھر، اس کی سواری یا اس کے لباس کو دیکھ کر اس کے بڑے یا چھوٹے ہونے کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ جو فرد کسی بڑے گھر میں رہتا ہے، اس کا کردار بھی عظیم ہو۔"

ایک مرتبہ سعودی فرماں روا شاہ فیصل بن عبد العزیز نے ابا جان کو پیش کش کی تھی کہ: "آپ میرے مشیر بن جائیے اور سعودی شہریت قبول کر لیجیے۔ ابا جان نے جواب میں کہا تھا: "میں دینی جذبے اور اپنی پاکستانی قومیت کے ساتھ یہاں لاہور میں بیٹھا ہوا آپ کا ہمہ وقتی مشیر ہوں۔ آپ جب چاہیں، اپنے

سفیر کے ذریعے یا براہ راست مجھ سے مشورہ کر سکتے ہیں۔ جو درست رائے ہو گی وہ پیش کر دوں گا۔ البتہ اگر آپ کی رعایا بن کر نوکری قبول کر لی تو پھر شاید صحیح مشورہ نہ دے سکوں گا۔"

نازک مزاج شاہاں، تابِ سخن ندارد

اسی طرح 1974ء کی ایک شام، ابا جان کے پاس اُردن کے فرماں روا شاہ حسین بن طلال کا فون آیا تھا۔ جب ہم نے پوچھا کہ شاہ حسین نے آپ سے کیا بات کی تھی؟ تو ابا جان نے بڑی بے نیازی سے کہا تھا: "ایسے لوگ اس قابل نہیں ہوتے کہ انہیں زیادہ اہمیت دی جائے۔ یہ لوگ باتیں تو بڑی لچھے دار کرتے ہیں لیکن یہ اسی وقت تک ہوتا ہے جب تک ان کے مفاد پر ضرب نہ پڑے اور اگر کہیں ان کے یا ان کی اولاد کے مفاد پر ذرہ برابر بھی زد پڑ جائے تو یہ لوگ صابن کے جھاگ کی مانند بیٹھ جاتے ہیں۔"

پھر قدرے توقف کے بعد فرمایا: "اصل قیمتی انسان وہ ہوتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے دین کے ساتھ وفادار ہوں اور اس کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔ جو آپ کے منہ پر تنقید کر سکیں اور پیٹھ پیچھے آپ کا دفاع کریں، ایسے لوگ ہی قدر دانی کے حق دار ہوتے ہیں۔ جب میں كلية التربية للبنات (سعودی کالج برائے خواتین) ریاض میں پڑھا رہی تھی تو ایک سعودی لیکچرار خاتون نے مجھے جتایا: "میں سعودی شہری ہوں اور باہر سے آئے ہوئے غیر سعودی اجانب (اجنبی) میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔" میں نے اسٹاف کے سامنے ہی ان کی اطلاع کے لیے عرض کیا: "آپ کے حاکم شاہ فیصل صاحب نے میرے والد کو سعودی شہریت کے ساتھ اپنی مشاورت کا منصب بھی پیش کیا تھا مگر میرے والد صاحب نے یہ پیش کش قبول نہیں کی تھی۔ جن مناصب کے پیچھے لوگ بھاگتے پھرتے ہیں، وہ مناصب ابا جان کے قدموں میں پڑے ہوئے تھے لیکن انہوں نے کبھی قبول نہ کیے۔"

یاد رہے جب ہماری یہ گفتگو ہوئی، تب شاہ فیصل بقید حیات تھے۔

اخوان المسلمون کے دوسرے مرشد عام شیخ حسن الھضیبی کی صاحبزادی ہمارے کالج کے شعبہ نباتیات (Botany) کی صدر شعبہ تھیں۔ وہ میٹنگ کے بعد خاص طور پر میرے پاس آئیں اور کہا: "تم واقعی ایک عظیم باپ کی بیٹی ہو۔ انہوں نے مجھے حضرت علیؓ کا قول سنایا: "دنیا کی یہ حقیقت ہے کہ تم اس کو لات مارو تو یہ تمہارے قدموں میں آ کر گرے گی۔ اس واقعے کے بعد سعودی عرب کے پورے قیام کے دوران میں مجھے غیر سعودی ہونے کا طعنہ دینے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔"

شاہ فیصل مرحوم کو ابا جان نے ایک اور اہم مشورہ بھی دیا تھا۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر شاہ فیصل اس پر عمل کر لیتے تو آج عالم اسلام کے حالات کچھ مختلف ہوتے۔ ابا جان نے شاہ فیصل بن عبدالعزیز سے بالمشافہ گفتگو میں کہا تھا: "جس طرح امریکا نے "ڈالروں" کے بل پر ساری دنیا کے اعلیٰ ترین دماغ کھینچ کر اپنے ملک میں جمع کر لیے ہیں اور اس طرح وہ ملک جو صرف پانچ سو برس پہلے دریافت ہوا تھا، اسے بے مثال ترقی دی ہے، اسی طرح آپ "ریالوں" کے بل پر، جن کی آپ کے پاس کوئی کمی نہیں ہے اور نہ رقبے کی آپ کے ملک میں کمی ہے، عالم اسلام کے اعلیٰ ترین دماغ کھینچ کر اپنے ملک میں جمع کر سکتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ایسے عالی دماغ ڈاکٹروں، سائنس دانوں، ماہرین سماجی علوم اور بلند پایہ محققین کو آپ سعودی عرب کی شہریت اور بنیادی حقوق بھی دیجیے۔ پھر آپ دیکھیے گا کہ سعودی عرب کو سماجی، علمی، صنعتی، معاشی، دفاعی امور، سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں کس قدر عروج نصیب ہوتا ہے اور یہ عروج صرف سعودی عرب کا عروج نہیں ہو گا بلکہ پورے عالم اسلام کا عروج ہو گا۔"

جواب میں شاہ فیصل نے فرمایا: ''میں ریالوں کے بل پر سارے عالم اسلام کے بہترین دماغ تو سعودی عرب میں جمع کر لوں اور انہیں شہریت سمیت دیگر حقوق بھی دے دوں لیکن پھر میرے ہم وطن بدو، بکریاں لے کر اور اونٹوں پر سوار ہو کر واپس خیموں میں چلے جائیں گے اور صحراؤں میں ایسے گم ہوں گے کہ ان کا نشان بھی کسی کو نہیں ملے گا۔''

افسوس کہ شاہ فیصل مرحوم کے بعد کے زمانے میں بھی خلیجی حکمرانوں نے زیادہ دور اندیشی سے کام نہ لیا۔ انجام کار اب تیل اور ریالوں کی ساری دولت، بڑی بڑی مہنگی گاڑیوں، پر تعیش محلات پر خرچ یا مغرب کے بنکوں میں دفن ہو کر رہ گئی۔ دفاع کا ذمہ دار امریکا بن بیٹھا ہے اور معیشت کی باگ ڈور مغربی ماہرین کے ہاتھ میں ہے۔ بدو مہنگی امریکی کاریں چلا رہے ہیں۔ یہ بد قسمتی کی بات ہے کہ ہمارے ہم عصر مسلمان اہل اقتدار کے دل اتنے چھوٹے، ظرف اتنے تنگ اور ذہن دُور اندیشی سے اس قدر عاری ہیں کہ وہ اپنے محدود اہداف کے سوا کوئی چیز دیکھ نہیں سکتے۔

ابا جان اکثر کہا کرتے تھے کہ دین اس وقت تک غالب نہیں آ سکتا جب تک کہ یہ امت، صحابہ کرامؓ کی وہ صفت اپنے اندر پیدا نہیں کرے گی، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، یعنی: وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا٘ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۛۚ (سورۃ الفتح 48: آیۃ 29)

(ترجمہ) اور جو لوگ نبی کریمؐ کے ساتھ ہیں، وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے، انہیں رکوع اور سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوش نودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں، جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔

کم و بیش موجودہ مسلم ممالک کے تمام سربراہان کی صورت حال یہ ہے کہ کفار کو دیکھتے ہی ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور خود سپردگی کا یہ عالم کہ ان کے آگے بچھے چلے جاتے ہیں اور جب مسلمانوں سے ملاقات ہوتی ہے تو آنکھیں ماتھے پر رکھ لیتے ہیں!

ایک جگہ ابا جان نے لکھا ہے: ''خدا کی شریعت بہادر شیروں کے لیے اتری ہے جو ہوا کا رخ بدل دینے کا عزم رکھتے ہوں۔ جو صبغتہ اللہ کو دنیا کے ہر رنگ سے محبوب رکھتے ہوں اور اسی رنگ میں تمام دنیا کو رنگ دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ مسلمان جس کا نام ہے وہ دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی آفرینش کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے دریا کو اس راستے پر رواں کر دے جو اس کے ایمان و اعتقاد میں راہ راست ہے۔ صراط مستقیم ہے!''

ایک بار میں نے ابا جان سے شکایت کی تھی کہ: ''سعودی عرب میں انگریزی کا نصاب نہایت لچر اور فضول ہے۔ مصری اور پاکستانی اساتذہ تو اور زیادہ نمک مرچ لگا کر اسے فحش بنا دیتے ہیں۔ اس پر ابا جان نے بطور خاص ایک تحریکی استاد کی ذمے داریوں کے حوالے سے مجھے کو ہدایت کرتے ہوئے کہا:

''ایک نصاب، درسی کتب میں لکھا ہوتا ہے اور دوسرا نصاب استاد کے ذہن میں ہوتا ہے۔ اصل اہمیت اس نصاب کی ہے جو استاد کے ذہن میں ہوتا ہے۔ اپنے دین سے لگن رکھنے والا استاد تو گیتا سے بھی قرآن پڑھا سکتا ہے، مراد یہ ہے کہ اگر اس کے پاس ایمان کی دولت موجود ہے تو وہ کفرستان میں بھی ایمان کی خوشبو پھیلا سکتا ہے۔'' پھر کہنے لگے: ''مجبوری میں ملنے والا بد ترین نصاب بھی اگر صحیح طریقے اور ایمان کی سلامتی کے ساتھ پڑھایا جائے تو وہ طالب علموں کی اصلاح کا باعث بن سکتا ہے۔''

میں جب بھی جدہ سے لاہور آتی تھی تو ابا جان مجھ سے اخوان المسلمون کے حوالے سے کسی خبر کے بارے میں پوچھتے تھے کیونکہ اخوات المسلمون میں سے اکثر میرے ساتھ کالج میں پڑھاتیں اور اپنے حالات بتاتی تھیں۔ ان میں سے ایک خاتون جو انگریزی کی لیکچرار تھیں، ایک روز بتانے لگیں: ''میرے شوہر،

جنرل نجیب کے فرسٹ کزن تھے۔ وہ، اخوان المسلمون اور جنرل نجیب کے درمیان ایک طرح سے رابطہ کار تھے۔ جمال عبد الناصر نے کنٹرول ہاتھ میں لینے کے بعد جس شخص کو سب سے پہلے گرفتار کیا، وہ میرا شوہر تھا۔ اس کو بد ترین اذیتیں دے کر اخوان کے نام، پتے پوچھے اور بہت سی گرفتاریاں کی گئیں۔ چونکہ میرا خاندان سماجی اثر ورسوخ کا حامل تھا، اس لیے بھاگ دوڑ کر کے اور معافی نامے داخل کر کے میں نے اپنے خاوند کو رہا کروا لیا۔"

اس نے مزید بتایا: "لیکن جب ہم اسے جیل سے رہا کروا کر لائے تو ہم نے محسوس کیا کہ جس شخص کو ہم جیل سے چھڑا کر لائے ہیں وہ ایک مختلف آدمی ہے۔ یہ وہ آدمی نہیں ہے جسے ہم جانتے تھے۔ وہ تو ایک اجنبی ہے! جب بھی ہم اس سے کوئی بات کرتے وہ بڑی عاجزی سے کہتا: "مجھے نہ ماریں، میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ رات کو سوتے سوتے وہ اٹھ کر چیخنے لگتا: مجھے مارو نہیں میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے اس کے علاوہ مجھے اور کچھ بھی معلوم نہیں۔ جب ہم کچھ کھانے کو دیتے تو وہ کہتا: مجھے تو 24 گھنٹوں میں ایک روٹی کھانے کو دی جاتی اور دو روٹیاں میرے سامنے کتے کو ڈالی جاتی تھیں۔ جب کتا روٹی چھوڑ دیتا تھا تو اس کی بچی کھچی روٹی میں کھاتا تھا۔ تم لوگ مجھے بار بار کھانا کیوں دیتے ہو، جیل سے رہائی کے بعد ایک بار بھی اس نے مجھے اور اپنے تین بچوں کو نہیں پہچانا۔ وہ انتہائی کمزور ہو چکا تھا۔ اس کی صحت تباہ ہو چکی تھی اور پھر چند ماہ کے بعد ایک دن وہ اچانک مر گیا۔" یہ سب تفصیلات بیان کرتے ہوئے اچانک میری نظر ابا جان کے چہرے پر پڑی۔ ان کے چہرے پر دکھ کے اس قدر گہرے آثار تھے کہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود میں آج تک انہیں نہیں بھلا سکی۔ کئی روز بعد میں واپس جدہ جانے لگی تو ابا جان نے مجھے پاس بلا کر کہا: "اس خاتون کو میرا اسلام کہنا!

سنہ 1978ء کے دوران میں جدہ سے گرمیوں کی تعطیلات کے سلسلے میں لاہور آئی ہوئی تھی کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ایک روز مغرب کے بعد پاکستان ایئر فورس کے دو اسکواڈرن لیڈر سرگودھا سے ابا جان سے ملنے آئے۔ ابا جان دفتر میں بیٹھے کام کر رہے تھے، وہیں انہیں بلوا لیا۔

ان میں سے ایک صاحب جو دیکھنے میں بڑے مضطرب نظر آ رہے تھے۔ بتانے لگے: "مولانا! میں نے ایک خواب دیکھا ہے اور جب سے دیکھا ہے میں اس قدر بے چین اور بے کل ہوں کہ نہ مجھے نیند آتی ہے، نہ بھوک لگتی ہے اور نہ میں کسی کام کو دل جمعی سے کر سکتا ہوں۔ وہ خواب یہ ہے کہ میں مدینے گیا ہوں، تو دیکھتا ہوں کہ مدینہ تو پورے کا پورا بمباری سے تباہ ہو چکا ہے۔ نہ مسجد ہے نہ گنبد خضرا ہے، نہ کوئی گھر اور عمارت سلامت ہے، اینٹ سے اینٹ بج چکی ہے۔ جب میں اس مقام پر آتا ہوں، جہاں روضہ مبارک ہے تو دیکھتا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کچی قبر کے باہر کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ کہیں قریب ہی سے بہت سے لوگوں کی باتیں کرنے کی آواز آتی ہے۔ میں ادھر دیکھتا ہوں تو ایک تہہ خانے میں سیڑھیاں اترتی نظر آتی ہیں۔ میں فوراً نیچے تہہ خانے میں چلا جاتا ہوں۔ ابھی آدھی سیڑھیاں ہی اترا تھا کہ دیکھتا ہوں، چھ سات یہودی صرف جانگیے پہنے، بڑے بڑے چھرے ہاتھوں میں لیے انسانی لاشوں کے ٹکڑے کر کر کے ڈھیر لگا رہے ہیں اور دیواروں کے ساتھ (اہل مدینہ کی) بے شمار انسانی لاشیں لٹکی ہوئی ہیں۔ میں یہ منظر دیکھ کر الٹے پاؤں اوپر کی طرف بھاگتا ہوں کہ یہ تو میرے بھی ٹکڑے کر ڈالیں گے۔ اوپر پہنچ کر دیکھتا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم التحیات پڑھ کر سلام پھیر رہے ہیں۔ سلام پھیر کر میری طرف دیکھ کر آپ فرماتے ہیں: "فکر نہ کرو، یہ گوشت بکے گا نہیں!" اور پھر فوراً ہی میری آنکھ کھل گئی۔ بس مولانا، جب سے میں نے یہ خواب دیکھا ہے، روز بروز میری بے کلی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے؟ آپ بتائیے، اس خواب کی تعبیر کیا ہے؟ اگرچہ ابا جان، خوابوں کی دنیا سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور نہ خوابوں کی تعبیر سے نتائج اخذ کرنے کے طرف دار تھے۔ وہ حقائق کی دنیا اور منطقی اصولوں کو ایمان کے تابع لا کر زندگی بسر کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود یہ خواب سن کر ابا جان خود حیران ہوتے جا رہے تھے کہ ایسا خواب تو بڑے بڑے ولیوں کو بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوتا مگر یہ اس داڑھی منڈے نوجوان ہوا باز کو نظر آیا ہے۔ کسی آستانہ عالیہ کے سجادہ نشین، کسی فقیہ، مصلحت بین اور کسی حاملِ جبہ و دستار کو نہیں بلکہ ستاروں پر کمند ڈالنے والے فضائیہ کے مجاہد کو دکھائی دیا ہے، جس کا ایک مطلب یہ ہے کہ مستقبل میں خانقاہوں کے مجاوروں اور

حجروں کے باسیوں کے بجائے، رسم شبیری ادا کرنے والے ایسے نوجوان ہی ملت بیضا کی قیادت کریں گے اور یہی لوگ حرمین الشریفین کی حفاظت و مدافعت کی ذمے داری نبھائیں گے۔

ابا جان نے اُن نوجوان جنگی ہوا بازوں سے کہا: "رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ جسے حضرت ابو ہریرہؓ نے روایت کیا ہے: **اذا وقعت الملاحم بعث الله بعثا من الموالی هم اکرم العرب فرسا واجود سلاحا یؤید الله بهم الدین** (مشکوٰۃ) جب جنگوں پر جنگیں ہوں گی تو اللہ، غیر عرب میں سے ایک قوم کو اٹھا کر کھڑا کرے گا۔ وہ شہواری میں عربوں سے بہتر اور اسلحے میں ان سے برتر ہوں گے۔ ان کے ذریعے اللہ اپنے دین کی مدد کرے گا۔"

پھر کہا: "یہ خواب اس حدیث کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے جو حضرت عبداللہ بن عَمرو سے مروی ہے: "(آخر زمانے میں) ایسے لوگ آئیں گے جو پرندوں کی طرح تیز رفتار اور درندوں کی طرح ظالم ہوں گے۔ (مشکوٰۃ)۔ یعنی آج ہمیں اس کا یہی مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ جنگی ہوائی جہازوں پر سوار ہو کر اپنے ملک سے اڑیں گے اور بڑی بے رحمی سے اپنے مخالفوں کے بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور مخلوق خدا کو تباہ و برباد کرتے جائیں گے، ان کے ہاتھوں نہ کسی کی جان و مال محفوظ ہو گی اور نہ عزت و آبرو!" تیسری حدیث مبارکہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو ذر غفاریؓ کو مخاطب کر کے فرمایا: "اے ابو ذر، جس وقت مدینے میں ایسی بھوک ہو گی کہ تو اپنے بستر سے کھڑا ہو کر مسجد تک نہیں جا سکے گا مگر یہ بھوک تجھ کو مشقت میں ڈال دے گی۔ اس وقت تیرا کیا حال ہو گا جب مدینے میں اتنا قتل ہو گا کہ خون احجار الزیت (چکنے پہاڑ) کو ڈھانپ لے گا۔" اسی طرح حدیث دجال سنا کر کہا: آپؐ کا خواب بظاہر اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ آئندہ صلیب و ہلال کے معرکوں میں ایئر فورس فیصلہ کن کردار ادا کرے گی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ خواب ایک جنگی پائلٹ کو دکھایا ہے۔ اس لیے یہ وقت اپنے طیارے کے کاک پٹ میں اذان دینے کا ہے۔ آپ کا فرض آپ کو پکار رہا ہے، ملت بیضا اور حرمین الشریفین کی حفاظت آپ کی ذمہ داری ہے۔ ایک حدیث کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد، انہی علاقوں سے فوج ان کی مدد کو پہنچے گی جو غیر عرب ہوں گے، اور اسلحہ و فن سپہ گری میں عربوں سے افضل ہوں گے۔ یاد رکھیے، آپ کی سب سے بنیادی وفاداری اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اس کے بعد حرمین سے ہے اور اس کے بعد اپنے وطن سے۔ آپ ان وفاداریوں کو بیک وقت نبھانے کے لیے اللہ اور قرآن سے تعلق جوڑیں اور اللہ تعالیٰ ہی سے مدد کی دُعا کرتے رہا کریں۔

یہ تعبیر سننے کے بعد جب وہ پائلٹ پر سکون ہو کر جانے کے لیے اٹھے تو بیماری اور سخت نقاہت کے باوجود، ابا جان نے کھڑے ہو کر ان سے الوداعی مصافحہ کیا اور اصرار کر کے انہیں اپنے کمرے کے دروازے تک رخصت کرنے آئے اور کہا: "چونکہ آپ نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے، اس لیے آپ تکریم کے لائق ہیں۔ اب آپ اپنی جو بے چینی اور بے کلی مجھے دے کر جا رہے ہیں، نہ جانے میں کب تک اس کیفیت میں مبتلا رہوں گا۔

اس روز جب ابا جان رات کو کھانا کھانے اندرونِ خانہ آئے تو ان کے چہرے پر خلاف معمول شدید اضطراب کے آثار تھے۔ انہوں نے جب یہ خواب اور اپنا تاثر بیان کیا تو خود ہم دہشت زدہ ہو کر رہ گئے۔ تب میرے ذہن میں علامہ محمد اقبال کے یہ اشعار تازہ ہو گئے:

چنان خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازی ہا

شہادت بر وجود خود ز خون دوستاں خواہی

مقام بندگی دیگر، مقام عاشقی دیگر

ز نوری سجدہ می خواہی ز خاکی بیش ازاں خواہی

(زبور عجم)

(ترجمہ) اگرچہ تو بے نیاز ہے لیکن چاہتا ہے کہ تیری توحید کی گواہی تیرے عاشق اپنے خون سے دیں۔ مقام بندگی اور ہے، مقامِ عاشقی اور ہے، بندگی کے اعتبار سے فرشتے سب سے آگے ہیں۔ اے اللہ! تو اپنی نوری مخلوق سے تو صرف سجدہ چاہتا ہے لیکن خاکی انسان سے تو اس سے کہیں بڑھ کر چاہتا ہے۔

میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ اسٹیج تیار ہو چکا ہے جس میں مسیح الدجال کو نکلنا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اترنا ہے۔ جیسا کہ ایک خطبے میں نبی کریمؐ نے فرمایا: "جب سے اللہ تعالیٰ نے دنیا بنائی اور اولاد آدم کو پیدا کیا ہے، تب سے زمین پر کوئی فتنہ، فتنہ دجال سے بڑا نہیں ہے۔ وہ شام اور عراق کے درمیانی علاقے سے نکلے گا اور بہت تیز چلتا ہوا چاروں طرف فساد پھیلا دے گا۔ دائیں بائیں سب جگہ پر آئے گا۔ پس اے بندگانِ خدا ،ثابت قدم رہنا۔ سنو، اس کے فتنوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ جنت اور دوزخ ہو گی۔ در اصل اس کی دوزخ، جنت ہے اور جنت، دوزخ ہے۔ اگر تم میں سے کسی کو ایسا موقع پیش آ جائے کہ وہ اسے اپنی جہنم میں ڈالنا چاہے تو وہ جناب باری تعالیٰ میں فریاد رسی چاہ کر سورۃ الکہف کے شروع کی دس آیات پڑھ لے تو وہ آگ اس پر ٹھنڈک اور سلامتی ہو جائے گی جیسا کہ خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہو گئی تھی۔ (مشکوٰۃ، جلد دوم، صفحہ 73)۔

میں نے جب ابا جان کے حوالے سے اپنی یاد داشتوں کو تازہ کیا تو اس خواب کی معنویت اور زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آئی۔ آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں، اس میں یہ خواب خود اپنی تعبیر ہے۔ کابل و قندھار کی بربادی، بغداد و بصرہ پر مسلط کی جانے والی تباہی، فلسطین و کشمیر میں خون کی ہولی اور گوانتا نامہ بے اور ابو غریب کی جیلوں میں ہونے والے مظالم، چیچنیا اور بوسنیا میں مسلمانوں پر تشدد کی بدترین مثالیں دیکھ کر کسی غلط فہمی کی گنجائش بھلا کہاں باقی رہ جاتی ہے۔ ایک جانب مکی و مدنی آقا کے پیروکاروں کی یہ داستان الم اور دوسری جانب اُمید کی بشارت اور عمل کی ترغیب، ہمارے لیے سبق آموز ہے۔ غیر عرب علاقوں سے، اسلام کی سربلندی کے لیے جس قوت کا تذکرہ ابا جان نے ان پائلٹوں سے کیا تھا، ان کی تائید مصر کے معروف اخبار الاہرام میں چھپنے والے اس بیان سے ہوتی ہے، جو مصر کے سابق چیف آف آرمی اسٹاف جنرل محمد عبد الحلیم ابو غزالہ کا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "پاکستانی مسلح افواج، عربوں کے تحفظ کی ضامن ہیں، جن کی پہنچ اسرائیل تک ہے۔ اس لیے اقتصادی بحران سے نکالنے کے لیے عربوں کو پاکستان کی مدد کرنی چاہیے، پاکستان کی کامیابی پورے عالم عرب کی کامیابی ہے۔"

پھر عالم عرب کے معروف اخبار "الاتحاد" میں اپنے ایک اور تجزیاتی مقالے میں جنرل محمد عبد الحلیم ابو غزالہ لکھتے ہیں: "پاکستان ایک بڑی عسکری قوت ہے، جس کے پاس ایٹمی وار ہیڈ ہیں، لہذا پاکستان کو پہنچنے والے کسی بھی نقصان کا براہ راست اثر عالم عرب کی صورت حال پر پڑ سکتا ہے۔" جنرل ابو غزالہ کے ان بیانات سے مذکورہ بالا خواب کی تعبیر مزید نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔

بار بار جیل جانے کی وجہ سے ابا جان کی صحت بہت زیادہ متاثر ہو گئی تھی، لہذا اماں جان نے اپنے درس قرآن کی مصروفیات کافی کم کر دی تھیں۔ وہ ماڈل ٹاؤن لیڈیز کلب میں 25 سال سے درس دے رہی تھیں، جہاں انہوں نے اپنی شاگردوں کی ایک ٹیم تیار کر لی تھی۔ آخر کار درس کا معاملہ اپنی شاگردوں کے حوالے کر دیا اور سارا وقت ابا جان کی خدمت میں گزارنے لگیں۔

ایک روز وہیں درس کی مجلس میں کسی نے اماں جان سے پوچھا تھا: "آپ نے کتنے مضامین میں ایم اے کیا ہے؟" تو کہنے لگیں: "بیٹی، ایم اے، بی اے تو آپ لوگ ہیں۔ میں نے تو دہلی کے کوئین میری اسکول سے مڈل تک پڑھا ہے۔ انہوں نے پوچھا، "پھر آپ کے پاس اتنا علم کیسے ہے؟" اس سوال کا اماں جان نے یہ جواب دیا: "میں نے زندگی ایک ایسے عالم دین کے ساتھ گزاری ہے، جن کی ایک گھنٹے کی بات چیت سن کر آدمی کو وہ علم حاصل ہوتا ہے جو لوگوں کو رات رات بھر کتابیں پڑھ کر بھی نہیں ملتا!" ایک مرتبہ کچھ خواتین اماں جان کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور قوم میں قحط الرجال کی شکایت کی۔ اماں جان خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہیں۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکیں جو وہ کہنا چاہتی تھیں، تو پھر اماں جان نے کہا: "اس قحط الرجال کی ذمہ دار یہ قوم خود ہے، ورنہ لیڈر اور رہنما تو اس قوم کو ایسے ملے تھے جو دوسری قوموں کو شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ اس قوم کو علامہ محمد اقبالؒ جیسے رہنما ملے، جن کو پوری دنیا کے مسلمان اپنا پیشوا و مرشد تسلیم کرتے ہیں۔ دوسرے رہنما اس قوم کو مولانا مودودی ملے، جنہوں نے افکار کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا، عصر حاضر کے جتنے بنیادی مسائل ہیں مثلاً فتنہ و فساد، بے پردگی، سود، مغربی جمہوریت، ضبط ولادت اور ان مسائل سے پیدا شدہ گھٹن۔ انہوں نے ان مہلک امراض کی بالکل صحیح تشخیص کر کے ان کا علاج قرآن و حدیث اور سنت نبویؐ سے پیش کیا، جو ایک بے مثال کارنامہ ہے لیکن اس قوم نے ان کی قدر نہ کی۔ پھر کہنے لگیں: "لوگ عام طور پر ذاتی تعصب یا سیاسی اختلاف کی بنا پر اپنے ہم عصر لوگوں کے ساتھ بہت بے رحمی سے پیش آتے ہیں، اور دانستہ ان کی خوبیوں اور عظمت کا اعتراف نہیں کرتے۔ یہ قوم بھی مولانا کی شخصیت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکی۔ جب سو برس گزر چکیں گے، تب اس قوم کو اندازہ ہو گا کہ وہ فرد پوری ملت اسلامیہ کے لیے کیا خدمات انجام دے گیا۔ ابھی تو اس قوم کو دما دم مست قلندر سے فرصت نہیں:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

جب ابا جان کی بیماری بڑھتی ہی گئی تو انہوں نے ہم سے کہا: "میں نے اپنے بدن پر بہت ستم ڈھائے ہیں۔ میں نے ان ہڈیوں پر ذرہ برابر ترس نہیں کھایا۔ اپنی آنکھوں کو نیند کی فطری ضرورت سے محروم رکھا۔ یہ سونا چاہتی تھیں مگر میں لکھنا چاہتا تھا۔ دن کے وقت میری اجتماعی زندگی کی مصروفیات مجھے لکھنے نہیں دیتی تھیں، اس لیے لے دے کر ایک رات ہی تو ہوتی تھی جب میں جم کر لکھ سکتا تھا۔ رات کے کھانے اور عشا کی نماز کے بعد جو کام کرنے بیٹھتا تھا تو بسا اوقات فجر کی اذان ہو جاتی تھی۔ اگر ایسا نہ کرتا تو تفہیم القرآن کیسے مکمل ہوتی؟ بس، اب یہ آنکھیں مجھ سے انتقام لے رہی ہیں۔ اب میں سونا چاہتا ہوں، لیکن یہ بند ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ انہیں میں نے جاگنے کی ایسی عادت ڈال دی ہے کہ یہ سونے پر آمادہ ہی نہیں ہوتیں۔ چاہتا ہوں کہ میرا ذہن سوچنا بند کر دے تاکہ پر سکون ہو کر سو جاؤں مگر دماغ کو سوچنے کی ایسی عادت ڈال چکا ہوں کہ یہ سوچنے سے باز ہی نہیں آتا۔ اب میری ہڈیاں مجھے سے انتقام لے رہی ہیں۔ پہلے میں نے انہیں آرام نہیں کرنے دیا تھا، اب یہ مجھے آرام نہیں کرنے دیتیں۔

درد دور کرنے والی ادویات کے استعمال نے ان کی صحت کو چاٹ لیا تھا۔ ایک دن باتوں باتوں میں اماں جان نے کہا: "تبدیلی آب و ہوا سے شاید آپ کی طبیعت سنبھل جائے۔ اس لیے میں امن (احمد فاروق) سے کہتی ہوں کہ آپ کو امریکا لے جائیں تاکہ وہاں اطمینان سے علاج ہو۔ مگر ابا جان وہاں جانا نہیں چاہتے تھے۔

ابا جان کی بیماری بڑھتی ہی گئی اور پھر بالآخر امریکا سے بھائی ڈاکٹر حمد فاروق آئے، اصرار کر کے ابا جان اور اماں جان کو 26 مئی 1979ء کو امریکا لے گئے، تاکہ وہاں رہ کر زیادہ یکسوئی سے ان کا علاج کروایا جا سکے۔ بہر حال امریکا میں مہینہ بھر قیام کے بعد علاج میں کچھ ردو بدل سے، طبیعت کافی بحال ہوئی اور انہوں نے سیرت سرور عالم کے مدنی دور پر پوری تندہی سے کام شروع کر دیا۔

ساتھ ہی امریکا اور کینیڈا کے طول و عرض سے ملاقاتیوں کا ایک ہجوم امنڈ پڑا۔ کافی تعداد میں ایسے لوگ آتے رہے جو ابا جان کی کتب پڑھ کر مسلمان ہوئے تھے۔ مشہور ناول (The Roots) کے مصنف الیکس ہیلے (Alex Haley) بھی دور دراز کا سفر کر کے ملنے آئے اور (The Roots) آٹو گراف کے ساتھ پیش کیا۔ آنے والوں میں سیاہ فام بھی تھے اور سفید فام بھی۔ مسلم ممالک کے لوگ بھی کافی تعداد میں آئے ، جنھوں نے یہی کہا کہ ہم تو صرف نام کے مسلمان تھے صحیح معنوں میں مسلمان توآپ کی تحریریں پڑھ کر ہوئے ہیں۔

ابا جان پر امید تھے کہ وہ سیرت سرور عالم پر کام مکمل کر لیں گے لیکن 8 ستمبر 1979ء کو دل کا شدید دورہ پڑا۔ ابھی حالت سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ 21 ستمبر کو طبیعت دوبارہ بگڑ کر تشویش ناک صورت اختیار کر گئی ۔ جگر اور گردے نے اچانک کام کرنا چھوڑ دیا۔ بال آخر وہ گھڑی آ ہی گئی جس کا آنا ہر ذی نفس کے لیے مقدر ہے اور جو کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی۔ 22 ستمبر 1979ء کو بفیلو کے ہسپتال میں پاکستانی وقت کے مطابق شام پونے چھے بجے ابا جان نے اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔ انا للہ وانا الیہ رجعون۔

يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ اِرْجِعِیٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ ○ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ○(سورہ الفجر89: آیۃ 27 تا 30)۔

(ترجمہ) اے مطمئن روح لوٹ چل، اپنے رب کی طرف، تو اپنے رب سے راضی ہے اور تیرا رب تجھ سے راضی، پس شامل ہو جا میرے صالح بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

یہ المناک خبر لے کر جب احمد فاروق، ہسپتال سے آئے تو وہ کم سے نڈھال تھے۔ اماں جان نے کمال ہمت و حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساری رات کے جاگے ہوئے بھوکے، پیاسے، غم زدہ بیٹے کو چائے بنا کر پلائی، بسکٹ کھلائے اور اپنا غم پس پشت ڈال کر بیٹے کو دلاسا دیتے ہوئے کہا: "شکر کرو، تم نے اپنے باپ کو دیکھا، ان کے سائے میں اتنی عمر گزاری، ورنہ وہ تو 1953ء ہی میں پھانسی چڑھنے کو تیار ہو گئے تھے۔ اگر اس وقت انہیں پھانسی دے دی گئی ہوتی تو تمھیں یہ یاد بھی نہ ہوتا کہ تمھارے ابا کی شکل کیسی تھی! ان کی آواز کیسی تھی۔" اللہ اکبر، ایسا حوصلہ اور ایسا توکل علی اللہ!

پھر، اماں جان نے سب کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہا: انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھیں اور باتیں نہ کریں۔ اس پر سب اکٹھے ہونے والے مرد و خواتین ان کے صبر و حوصلے پر حیران رہ گئے۔ میرے ماموں ڈاکٹر جلال الدین شمسی، ٹورانٹو (کینیڈا) سے بذریعہ کار اماں جان کے پاس آئے تو شدت غم سے نڈھال تھے۔ مگر وہ اماں جان کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہنے لگے: "آپا جان، میں ٹورانٹو سے بفیلو (امریکا) تک روتا ہوا آیا ہوں۔ سوچتا تھا کہ آپ کا سامنا کیسے کروں گا؟ آپ سے کیا کہوں گا؟ لیکن آپ کو دیکھ کر تو میرے آنسو خشک ہو گئے۔ ایسی ہی حیرانی مجھے اس وقت ہوتی تھی، جب بھائی صاحب جیل جاتے تھے اور آپ چھوٹے چھوٹے بچوں کو لیے اطمینان سے بیٹھی رہتی تھیں۔ مجھے بتائیے کہ آپ کے پاس کون سی روحانی طاقت ہے؟ آپ یہ سب کیسے برداشت کر لیتی ہیں؟ اماں جان نے کہا: "اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان، توکل اور صبر وہ صفات ہیں جن کی مدد سے انسان مشکل ترین حالات سے بخیر و خوبی گزر سکتا ہے۔

احمد فاروق بھائی نے جہاز سے ابا جان کے جسد خاکی کو نیو یارک پہنچایا۔ اسی اثنا میں امریکا میں مختلف ٹیلی وژن چینل ابا جان کے انتقال کی خبر بریکنگ نیوز کے طور پر نشر کر چکے تھے۔ اس لیے نیو یارک ایئر پورٹ پر بڑی تعداد میں مختلف ممالک کے مسلمان جنازے میں شرکت کے لیے پہنچ گئے۔ احمد فاروق نے اماں جان کو مسافر لاؤنج میں بیٹھا دیا۔ اسی دوران میں وہاں بہت سی پاکستانی، ہندوستانی، ترک، عرب اور افریقی ممالک کی خواتین آ گئیں۔ ان کے ہمراہ آنے والے مرد باہر نماز جنازہ کے لیے کھڑے تھے۔ کچھ پاکستانی خواتین نے جو اماں جان کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں، آپس میں باتیں کرنا شروع کر دیں:

بفیلو سے میت آئی ہے، پتا نہیں ڈیڈ باڈی پہنچی ہے یا نہیں؟" اماں جان نے کہا: "میت پہنچ گئی ہے؟" ان عورتوں نے چونک کر اماں جان کی طرف دیکھا اور پوچھا: "آپ کو کیسے پتا چلا کہ میت پہنچ گئی ہے؟" انھوں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: "میں میت کے ساتھ آئی ہوں۔" عورتوں نے پوچھا: "آپ کا ان سے کوئی تعلق ہے؟" جواب ملا: "وہ میرے شوہر تھے۔" وہ عورتیں چیخ پڑیں: "ارے بیگم صاحبہ، آپ اتنے اطمینان اور اتنے سکون سے اتنا بڑا صدمہ دل میں لیے یوں بیٹھی ہوئی ہیں اور ہمارے مرد تو سارا راستہ روتے آئے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر اللہ یاد آ گیا جس نے یہ حوصلہ عطا کیا ہے۔" پھر آہستہ آہستہ وہاں موجود ترک، انڈونیشی، عرب اور افریقی ممالک کی خواتین کو بھی پتا چل گیا کہ یہ خاتون، مولانا مودودی صاحب کی اہلیہ ہیں۔ ان سب نے اماں جان سے تعزیت کی اور کہا: "صبر تو اسی کو کہتے ہیں۔" اندر پسنجرز لاؤنج میں یہ باتیں ہو رہی تھیں اور باہر نماز جنازہ ادا کی جا رہی تھی۔ جگہ کی تنگی کے باعث نیو یارک ایئر پورٹ پر چھے مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔

جب جہاز لندن پہنچا تو وہاں عملاً پورے یورپ کے نمایندہ مسلمان جمع تھے۔ وہاں بھی اسی طرح کئی بار نماز جنازہ ادا کی گئی۔ غرض یہ کہ ابا جان اس شان سے رخصت ہوئے کہ تین بر اعظموں کو جگاتے ہوئے خود اپنی آخری آرام گاہ میں چلے گئے۔ انھوں نے سب کچھ دوسروں کے لیے کیا۔ اپنی ذات اور اولاد کے مادی مستقبل کو خاطر میں نہ لائے۔ اس لیے کہ وہ ایک اعلیٰ مقصد زندگی اور مشن رکھتے تھے۔

جس روز اماں جان، میت لے کر لاہور پہنچیں تو سب بچوں کو تسلی دی اور صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہا: "ان کے لیے نہ روؤ، یہ خاکی جسم تو میلے کپڑوں کی مانند ہے، اس لیے کہ جسم، روح کا لباس ہوتا ہے۔ کبھی یہ لباس نیا تھا، خوب صورت تھا، دیکھنے والوں کو بھلا لگتا تھا، لیکن پھر یہ لباس پرانا ہو گیا۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا، جگہ جگہ پیوند لگانے پڑے، کہیں کہیں رفو کرنا پڑا، اور پھر یہ پہنے کے قابل نہ رہا، اور روح نے اس کو اتار کر رکھ دیا ہے۔ اس کی جگہ اللہ تعالی کے نور کا لباس پہن لیا ہے۔ اب تمھارے ابا بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں، وہ بہت آرام سے ہیں اور اپنے حقیقی قدر دان کے پاس چلے گئے ہیں۔ یہ تم جو دیکھ رہے ہو، یہ تو روح کے میلے کپڑے ہیں، جو تابوت میں بند ہو کر امریکا سے آئے ہیں۔ بھلا پھٹے ہوئے کپڑوں پر بھی کوئی روتا ہے۔

اس طرح انھوں نے اپنے انداز میں سب بچوں کو پُرسا دیا اور صبر کی تلقین کی۔ ان الفاظ میں کیا جادو تھا کہ انھیں سنتے ہی ہمارے آنسو خشک ہو گئے۔ وہ بڑے حوصلے کے ساتھ اس صدمے کو جھیل گئیں لیکن پھر کچھ عرصے بعد افسردگی کا شکار ہو گئیں۔ ابا جان کی رحلت کے کچھ عرصے بعد میں جدہ سے گرمیوں کی چھٹیوں میں لاہور آئی ہوئی تھی۔ اماں جان کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے، میں اصرار کر کے انھیں اپنے ساتھ جدہ لے گئی۔ پہلے تو وہ میرے ساتھ جانے پر راضی نہ ہوئیں اور کہا: "بیٹی کے گھر بھلا کیسے جا سکتی ہوں۔" میں نے بہت سمجھایا: "آپ نے بیٹیوں کی طرح پالا پوسا، بیٹیوں کی طرح پڑھایا لکھایا، اب میں بیٹوں کی طرح محنت کر کے کلیہ البنات میں پڑھاتی اور کماتی ہوں، اس لیے آپ مجھے بیٹی نہیں بلکہ بیٹا سمجھیں! آپ کی افسردگی کا علاج دواؤں میں نہیں، مکہ اور مدینہ کی ہواؤں میں ہے۔ یہ سن کر وہ چلنے پر راضی ہو گئیں۔ وہاں پہنچ کر میں نے ان کا اقامہ بنوا لیا، تاکہ آنے جانے میں کوئی دشواری نہ رہے۔ پہلا ہی عمرہ کر کے آئیں تو تمام دوائیاں اٹھا کر الماری میں رکھ دیں اور کہا کہ اب ان کی ضرورت نہیں۔

رمضان المبارک میں کئی عمرے کیے اور آخری عشرے میں ہم ان کو لے کر مدینہ منورہ چلے گئے۔ پاکستان ہاؤس میں قیام تھا، جو ان دنوں مسجد نبویؐ کے باب النساء کے بالمقابل تھا۔ اماں جان کا اصرار ہوتا تھا کہ سب سے اگلی صف میں جگہ لینی ہے۔ اس لیے ہم بھاگم بھاگ مسجد میں پہنچ کر اگلی صف میں جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ اس افراتفری میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ اماں جان سحری کے وقت دمے کی یا بلڈ پریشر کی، یا اختلاج قلب کی دوائیں کھانا بھول گئیں اور سحری کا وقت ختم ہو گیا۔ ایک دن میں نے عرض کیا: "دوائی، خاص طور پر دل کی دوائی تو آپ کبھی نہ بھولیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ مسجد نبویؐ کے سامنے پہنچ کر مسجد میں جانے سے محروم رہ جائیں تو وہ میری طرف دیکھ کر بڑی حسرت سے کہنے لگیں:

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے

میں وہاں سے تھوڑی دیر کے لیے دوسری جانب گئی اور جب واپس آئی تو دیکھا کہ میرا بیٹا اطہر، اماں جان سے پوچھ رہا تھا: امی تو کہتی ہیں کہ نانا ابا کتابیں لکھتے تھے اور آپ کہتی ہیں کہ وہ دل کی دوائی بیچتے تھے۔ اماں جان اس بچے کو بڑی محبت سے سمجھا رہی تھیں: "جو کچھ وہ لکھتے تھے، دل کی دوائی اسی میں ہوتی تھی۔"

پھر 29 ویں شب آئی۔ یہ ختم قرآن کی شب تھی۔ پورے مدینہ میں اور خصوصاً مسجد نبوی میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ اس لیے ہم لوگ بھی بہت پہلے سے عشا کی نماز کے لیے مسجد کی پہلی صف میں جا بیٹھے تھے۔ اقامت سے ذرا پہلے یکایک مسجد کی دو منتظم سعودی عورتیں اور ایک شرطہ آ موجود ہوئے اور بڑے کرخت لہجے میں زور زور سے حکم صادر کرنا شروع کیا: "ارجعوا او رائی ارجعو او رائی" (پیچھے ہٹو، پیچھے ہٹو) ہم جب پیچھے دیکھتے تھے تو پوری جگہ اس طرح بھری ہوئی تھی کہ تھال پھینکو تو سروں کے اوپر ہی اوپر سے پھسلتا جائے۔

آخر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے بھی اسی طرح سخت لہجے میں پوچھا: "لم نرجع و رائی؟" (ہم پیچھے کیوں ہٹیں؟) انہوں نے مجھے سعودی سمجھتے ہوئے جواب دیا: **ضیوف خاص جاؤ امن بحرین** (بحرین سے خاص مہمان آئے ہیں)۔ میں نے بھی اسی طرح سخت لہجے میں ڈانٹ کر کہا: "**انا کلنا ضیوف خاص وهذا مسجد الرسول صلی الله علیه وسلم ونحن ضیوف الرسول صلی الله علیه وسلم! هذا مسجد لیس هو قصرهم۔**" (ہم سب خاص مہمان ہیں اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہیں۔ یہ مسجد نبوی ہے، کوئی ان کا محل نہیں ہے!)

میں نے یہ کہا ہی تھا کہ ساری سعودی خواتین جو نماز پڑھنے کے لیے بیٹھی تھیں یک زبان ہو کر بول اٹھیں: "**صح صح کلام مضبوط! والله کلام مضبوط!**" (بالکل صحیح بالکل صحیح خدا کی قسم! بالکل درست بات ہے) اتنی دیر میں اقامت کی آواز بلند ہو گئی اور ہم اللہ اکبر کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ شرطہ اور شرطیاں (لیڈی پولیس ورکرز) وہاں سے چلے گئے لیکن جب ہم نے فرضوں کا سلام پھیرا اور سعودی خواتین نے میرا پاکستانی لباس دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا: "**والله انت باکستانیة؟ من این تعلمت عربی؟**" (خدا کی قسم، کیا تم پاکستانی ہو؟ تم نے عربی کہاں سے سیکھی؟) تو میں نے اماں جان کی طرف اشارہ کیا اور کہا: "**من امی و ابی**" (اپنے والدین سے)۔ ان خواتین نے یہ سن کر اماں جان کے ہاتھ چوم لیے۔ عید کی نماز پڑھ کر ہم جدہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ واپس آ کر میں نے اماں جان سے پوچھا کہ آپ مدینہ منورہ میں عبادت سے خوش تو ہیں نا؟ تو بس ٹھنڈی سانس بھر کر اتنا ہی کہا:

روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شُد!

(ترجمہ) ہم نے جی بھر کر پھول کو دیکھا بھی نہیں کہ بہار کا موسم ختم ہو گیا۔

ان دنوں میری بیٹی رابعہ کو میٹرک کا امتحان دینا تھا۔ میں اسے نصیحت کرتی رہتی تھی: "بیٹی، تمہیں ہر حالت میں اے گریڈ لینا ہے، تیاری بہت اچھی اور مکمل ہونی چاہیے کیونکہ میٹرک کے رزلٹ پر ہی تمھارا پورا تعلیمی مستقبل منحصر ہے۔ شاید اماں جان نے سن کر یہ بات پلے میں باندھ لی تھی۔ پھر جو نماز بھی پڑھتی تھیں، اس قدر لمبی ہوتی تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔

ایک دن میں نے اماں جان سے پوچھ ہی لیا: "آج کل آپ نمازوں میں بہت زیادہ مشقت برت رہی ہیں، کہیں اتنی لمبی لمبی نمازوں کے بعد طبیعت خراب نہ ہو جائے۔ انہوں نے اس بات کا جو جواب دیا، وہ وہی بات تھی جو ایک ہفتہ پہلے میں نے رابعہ سے کہی تھی۔ کہنے لگیں: "امتحان تو مجھے بھی دینا ہے اور امتحان بھی ایسا جس پر پوری اُخروی زندگی کا انحصار ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ہر پرچے میں میرا بھی اے گریڈ آئے، یعنی ہر نماز اے گریڈ کی ہو، ہر روزہ اور ہر عمرہ اے گریڈ کا ہو۔"

اور پھر جب کبھی ہم لمبے سفر پر جاتے تھے، مثلاً مدینہ منورہ یا طائف وغیرہ تو اماں جان گاڑی کے ڈیش بورڈ پر قرآن شریف رکھ لیا کرتی تھیں۔ پورے راستے میں کوئی بات کیے بغیر قرآن شریف کی کوئی سورہ حفظ کرتی رہتی تھیں۔ غنچہ ہے تو گل ہو، گل ہے تو گلستاں ہو، کے مصداق ہر وقت اپنے علم میں اضافہ کرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں۔ اسی کوشش میں ایک بار سورۃ الفتح حفظ کی، ایک مرتبہ سورۃ الکہف کی ابتدائی دس اور آخری دس آیات حفظ کیں اور مسجد نبویؐ میں پہنچ کر تازہ حفظ کی ہوئی آیات نماز میں تلاوت کیں اور پھر یہ حدیث نبویؐ سنائی: "سب سے افضل تلاوت قرآن وہ ہوتی ہے جو نماز میں کھڑے ہو کر کی جائے۔" جب سورۃ الکہف کی ابتدائی اور آخری دس آیات یاد کر کے مسجد نبویؐ میں پہلی بار نماز میں پڑھیں تو کہنے لگیں: "ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑی دولت ہے جو میں نے اپنے اندر سمیٹ لی ہے۔" تھوڑی دیر بعد کہا: "یقین کرو، ساری دولت، مادی طاقت، سارا حسن اور سنگھار اور کمال تو آدمی کے اندر ہوتا ہے، باہر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ بہت سے لوگ جو یہ چیزیں باہر تلاش کرتے ہیں، وہ اندر سے بڑے مفلس، بہت کمزور اور کریہہ المنظر ہوتے ہیں، اسی لیے تو انہیں یہ چیزیں باہر تلاش کرنی پڑتی ہیں۔"

اس روز میری سمجھ میں آیا کہ کیوں اماں جان نے ابا جان سے بھی کوئی مطالبہ نہیں کیا، کبھی میک اپ نہیں کیا اور کبھی زیوروں کی خواہش نہیں کی۔ در اصل ان کو ایسی مصنوعی چیزوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ان کا باطن اتنا غنی، بھر پور اور حسین تھا کہ باہر انہیں کچھ اور چاہیے ہی نہیں تھا۔

اماں جان کی خواہش تھی کہ مکہ مکرمہ میں بھی اسی طرح ایک دو ہفتے رہ کر عبادت کی جائے۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر حافظ عبدالحق صاحب کی بیگم فرحانہ بہن سے بات کی۔ انہوں نے فلیٹ کا انتظام کر دیا اور وہ خود ان کے ساتھ دو ہفتے رہیں اور ان کی بے حد خدمت کی۔ اماں جان کی عادت تھی کہ وہ کئی بار بات کا جواب شعر میں دیتی تھیں۔ جب مکہ معظمہ سے واپس آئیں تو میں نے پوچھا: "اماں جان، آپ کی وہاں عبادت کیسی رہی؟" جواب ملا:

نمی دانم چہ منزل بود، شب جائے کہ من بودم

بہر سو رقص بسمل بود، شب جائے کہ من بودم

خدا خود میر مجلس بود، اندر لامکاں خسرو

محمد شمع محفل بود، شب جائے کہ من بودم

(ترجمہ) مجھے نہیں معلوم وہ کیا منزل تھی، جہاں میں رات کو تھا۔ ہر طرف زخمیوں کے تڑپنے کا رقص جاری تھا، جہاں میں رات کو تھا۔ اے خسرو، لامکاں میں خدا خود میر مجلس تھا اور وہاں محمدؐ شمع محفل تھے، جہاں میں رات کو تھا۔

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ اس جواب پر یقیناً امیر خسرو کی روح بھی وجد میں آ گئی ہو گی کہ اماں جان کی طرف سے ایک اور شعر عطا ہوا:

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں

اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

پھر مسکرا کر کہنے لگیں: "اس شعر کا اصل مطلب تو حرم شریف میں جا کر کھلا، جب خانہ کعبہ کی طرف دیکھتی تھی تو لوگ پروانہ وار طواف کر رہے ہوتے تھے اور انہیں دنیا و مافیا کا کوئی ہوش نہیں ہوتا تھا۔ جب صفا و مروہ میں جا کر دیکھتی تھی تو سعی کرنے والے دیوانہ وار سعی کر رہے ہوتے تھے اور پھر جب حرم شریف سے واپس اپنے فلیٹ کی طرف آ رہی ہوتی تھی تو دکانوں میں خریداروں کا زبردست رش ہوتا تھا۔ وہاں بھی پروانے دیوانہ وار سونا، کپڑا، گھڑیاں اور گھریلو استعمال کی مختلف چیزیں خریدنے کے لیے چکر لگا رہے ہوتے تھے۔ آخرت میں کامیابی کے طلب گار تو اپنی طلب میں دیوانے ہو کر پروانہ وار طواف و سعی کر رہے ہوتے تھے اور دنیا کے پرستاروں کو ان چیزوں کی طلب پاگل کیے دیتی تھی؟ ادھر جب پاکستان میں اسماء، خالد اور عائشہ نے بہت اصرار کیا تو وہ واپس لاہور آ گئیں لیکن اُن دنوں کو کبھی نہ بھولیں جو انہوں نے مکہ اور مدینہ میں گزارے تھے۔

مجھے ابا جان کی کہی ہوئی ایک بات اکثر یاد آتی ہے، جو انہوں نے میرے ماموں خواجہ محمد شفیع مرحوم سے کہی تھی۔ اس وقت اماں جان بہت بیمار تھیں اور ماموں ان کی خیریت دریافت کرنے آئے تھے۔ ابا جان نے کہا: "جب لوگ نعرے لگاتے ہیں مولانا مودودی زندہ باد! جماعت اسلامی زندہ باد! تو میں اپنے دل میں کہتا ہوں، محمودہ بیگم زندہ باد۔ جب کوئی فوج فتح مند ہوتی ہے اور اس کے سپہ سالار کو پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا جاتا ہے تو اس وقت اس گم نام سپاہی کو کوئی یاد نہیں رکھتا، جس نے اپنی نقد جان کی بازی ہار کر فتح کو ممکن بنایا ہوتا ہے۔ زندہ باد کے فلک شگاف نعروں میں بھلا کس کو کسی کی بے نفسی، خود داری اور وفا داری یاد رہتی ہے۔"

اماں جان اپنے استادوں کی بہت عزت و تکریم کرتی تھیں۔ دار الاسلام میں قیام کے زمانے میں مولانا امین احسن اصلاحی روزانہ عصر سے مغرب تک درس قرآن دیا کرتے تھے۔ اماں جان بڑی باقاعدگی سے ان کا درس سنا کرتی تھیں اور پھر درس سے واپس آ کر سبق یاد کیا کرتی تھیں۔ اسی طرح محترم مولانا عبد الغفار حسن سے حدیث پڑھی ۔ ان دونوں اصحاب علم و فضل کی وہ بڑی تکریم کرتی تھیں اور ان کو اپنے استاد کہا کرتی تھیں۔ بعد ازاں ان دونوں کے جماعت سے علیحدہ ہونے کا انہیں بہت صدمہ ہوا تھا۔ مولانا اصلاحی صاحب کی چھوٹی صاحبزادی کی وہ رضاعی ماں بھی تھیں۔ اس حوالے سے وہ کہا کرتی تھیں کہ: "میری تین نہیں چار بیٹیاں ہیں۔"

ان کی یہ ادا مجھے کبھی نہیں بھولتی کہ انہوں نے اپنے عظیم شوہر کے عظیم نام کو کبھی جنس بازار نہیں بنایا۔ ابا جان کے انتقال کے بعد صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے اماں جان کو سینیٹ کی رکنیت قبول کرنے کی پیش کش کی۔ اس مقصد کے لیے پہلے عطیہ عنایت اللہ صاحبہ کو اور پھر آپا نثار فاطمہ مرحومہ کو بھیجا۔ اماں جان نے عطیہ عنایت اللہ صاحبہ کو تو پیار سے ٹال دیا لیکن جب آپا نثار فاطمہ آئیں تو انہیں اپنا پسندیدہ مصرع سنایا۔

سوداگری نہیں، یہ عبادت خدا کی ہے

اور پھر کہا: "یہ قرآن و حدیث کا علم دنیا کمانے اور دنیاوی عہدے حاصل کرنے کے لیے نہیں ہے، یہ تو آخرت کمانے کا ذریعہ ہے۔" پھر کہنے لگیں: "میں اپنے نیک نفس شوہر کے نام کو "جنس بازار" نہیں بنا سکتی۔ لوگ اپنی اور اپنی اولاد کی دنیا بنانے کے لیے جیتے ہیں لیکن مولانا صاحب تو اللہ تعالی کے دین کی سربلندی اور خدمت کے لیے جیتے تھے۔ ان کے حسب حال تو بس نصر اللہ خاں عزیز کا یہ شعر تھا:

میری زندگی کا مقصد، تیرے دین کی سرفرازی

میں اسی لیے مسلماں، میں اسی لیے نمازی

پھر کہنے لگیں: "اس دنیا میں مجھے اور میرے بچوں کو اس "نام" کو کیش کرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اس نے ہمیں اپنے دَر سے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ اس "نام" کی ضرورت ہمیں اس دن ہو گی جس کے بارے میں اللہ تعالی نے وعدہ فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ○

(سورۃ الطور 52: آیۃ 21)

(ترجمہ) جو لوگ ایمان لائے ہیں اور ان کی اولاد بھی کسی درجہ ایمان میں ان کے نقش قدم پر چلی ہے، ان کی اس اولاد کو بھی ہم (جنت میں) ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان کے عمل میں کوئی گھاٹا ان کو نہ دیں گے۔"

پس میں تو اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتی ہوں کہ وہ میرا اور میرے بچوں کا انجام ان کے ساتھ کر دے۔ ہم سب کو ان کے جہاد فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل اللہ کا وارث بنائے اور جنت الفردوس میں ہم سب کو اکٹھا کر دے۔ آمین! پس مولانا صاحب نے اپنے خدا کو راضی کر لیا اور خلق کی پروا تک نہ کی۔ سارے جہاں سے لڑائی مول لی لیکن خالق کو ناراض کر کے کبھی مخلوق کو راضی کرنے کی کوشش نہ کی:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

آخری عمر میں اماں جان ہر وقت ابا جان کو یاد کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ سخت گرمی اور حبس تھا کہ اچانک بجلی چلی گئی اور دیر تک نہ آئی۔ اماں جان چونکہ دمے کی دائمی مریضہ تھیں، اس لیے گرمی اور حبس سے ان کا برا حال ہو گیا۔ بجلی تھی کہ کسی طرح آنے کا نام نہ لیتی تھی، اس حالت میں ذرا سی آنکھ لگ گئی۔ جب بیدار ہوئیں تو کہا: "ابھی تمھارے ابا جان کی آواز آئی ہے، تم وہاں گرمی میں کیوں بیٹھی ہو، اوپر آ جاؤ نا۔ دیکھو یہاں کیسی اچھی ہوا چل رہی ہے!" پھر بڑی حسرت سے کہنے لگیں: "بھلا میں خود کیسے جا سکتی ہوں؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا آتا ہے۔"

جب طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو میری بہن اسماء خاتون انہیں اپنے گھر لے گئیں، جو ابا جان کے گھر سے جڑا ہوا ہے۔ چند روز بعد میں انہیں ملنے گئی تو معلوم ہوا کہ آج اماں جان نہ بات کرتی ہیں اور نہ کچھ کھا رہی ہیں۔ میں نے ان کے پاس جا کر بس اتنا کہا:

دلی جو ایک شہر تھا، عالم میں انتخاب

اماں جان نے فوراً کہا:

کیا بود و باش پوچھو ہو، پورب کے ساکنو

ہم کو غریب جان کے، ہنس ہنس پکار کے

دلی جو ایک شہر تھا، عالم میں انتخاب

رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اس کو فلک نے لُوٹ کے ویران کر دیا

ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

میں نے کہا: "اماں جان کون کہتا ہے کہ آپ بیمار ہیں، آپ تو بالکل تندرست ہیں۔ لیجیئے، کھانا کھا لیجیئے۔ پھر وہ دلی شہر کی باتیں کرتی رہیں اور بڑی خوشی سے کھانا کھا لیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ بہت بیمار تھیں اور کسی کو پہچان بھی نہیں رہی تھیں، بس یہی کہہ رہی تھیں: "کوچہ پنڈت جانا ہے۔" جب میں گئی تو اسماء نے پوچھا: "کوچہ پنڈت کیا ہے؟" میں نے بتایا کہ: "یہ دہلی کا ایک مشہور محلہ ہے جہاں ان کا سسرال، یعنی ابا جان کا گھر تھا۔" اس کے بعد میں نے دہلی کے کئی محلوں کے نام لیے اور جب چاندنی چوک کا ذکر کیا، تو بہت خوش ہوئیں لیکن کھانا کھانے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوئیں۔ میں نے عرض کیا:

سوداگری نہیں، یہ عبادت خدا کی ہے

اماں جان تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی اور ذہن پر زور ڈالتی رہیں اور کہا:

او بے خبر، جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

واعظ ، کمال ترک میں ملتی ہے یاں مراد

دنیا بھی چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

اور پھر میرے ہاتھ سے سُوپ پی لیا۔

آخری دنوں میں کسی کو پہچاننا ان کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ ایک دن مغرب کے وقت کہنے لگیں: "روزہ کھولو! جلدی کرو مسجد نبویؐ میں تراویح پڑھنی ہے، آج ختم قرآن ہے، جلدی کرو۔ اگلی صف میں جگہ لینی ہے؟ پھر کہنے لگیں: "لو دیکھو اتنی مشکل سے پہلی صف میں جگہ ملی ہے، اب کہتے ہیں پیچھے ہٹو، خاص مہمان آئے ہیں۔ ارے بھائی، ہم سب خاص مہمان ہیں، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد ہے، کسی بادشاہ کا محل نہیں ہے۔"

آس پاس سب لوگ حیران تھے کہ اماں جان کیا کہہ رہی ہیں لیکن میں سمجھ گئی کہ ان کی روح زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہو کر اس وقت مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے اور وہ اس رات کو رمضان المبارک کی 29 ویں رات سمجھ رہی ہیں ۔ اس دُنیا میں یہ آخری بات تھی جو انہوں نے کی، اور اس کے بعد بالکل خاموش ہو گئیں: انا للہ وانا الیہ راجعون!

روایت ہے کہ مولانا روم کے مرض الموت میں ایک عالم دین ان کی عیادت کو آئے اور کہنے لگے: "فکر نہ کیجیے، ان شاء اللہ شفا ہو گی۔" مولانا روم نے جواب دیا: "اب شفا آپ کو مبارک ہو، بال برابر فرق رہ گیا ہے۔ پھر نور، نور میں شامل ہو جائے گا اور مٹی مٹی میں چلی جائے گی:

خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات

ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

ابا جان نے 22 ستمبر 1979ء کو رحلت فرمائی اور اماں جان 14 اپریل 2003ء کو بروز جمعہ رات 8 بج کر 20 منٹ پر اس جہان فانی سے رخصت ہوئیں اور لگلے دن بروز ہفتہ سوا گیارہ بجے مٹی میں جا ملیں۔

یہ سر گزشت میں اماں جان کے پسندیدہ شعر پر ختم کرتی ہوں:

سوئیں گے حشر تک کہ سبک دوش ہو چکے

بار امانت غم ہستی اتار کے

ختم شد